’’پچیس برس کی تجربہ سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ جو لوگ بے علمی کے ساتھ مجتہد مطلق اور مطلق تقلید کے تارک بن جاتے ہیں، وہ آخر اسلام کو سلام کر بیٹھتے ہیں، کفر وارتداد وفسق کے اسباب دنیا میں اور بھی بکثرت موجود ہیں، مگر دینداروں کے بے دین ہوجانے کے لئے بے علمی کے ساتھ ترکِ تقلید بڑا بھاری سبب ہے، گروہِ اہل حدیث میں جو بے علم یا کم علم ہوکر ترکِ تقلید کے مدعی ہیں وہ ان نتائج سے ڈریں، اس گروہ کے عوام آزاد اور خودمختار ہوجاتے ہیں‘‘۔

(معروف غیر مقلد عالم مولانا محمد حسین بٹالوی ا)

1

J:\2009\ZamZam\Rah-e-Aetidal\1st Proof Contents-ok.........(15-06-09)

First Proof	15-06-09
Second Proof	00-00-00
FINAL	00-00-00
TOTAL-PAGE	

بیــنـــا وبیــن الـنـاس ابـو حـنـیـفة،
فـمـن احبــه وتـولاه عـلـمـنـا انـه من
اهـل الـسـنـة و مـن ابـغـضـه علمنا انه
من اهل البدعة.

ترجمہ: ''ہمارے اور لوگوں کے درمیان وجہ امتیاز
امام ابوحنیفہ ا ہیں، جس نے آپ ا سے
محبت رکھی، ہم سمجھتے ہیں کہ وہ اہل سنت میں سے ہے، اور
جس نے آپ ا; سے بعض رکھا، ہم سمجھتے ہیں کہ وہ
اہل بدعت میں سے ہے''۔

(حافظ حدیث عبدالعزیز ابن ابی رواد ا)

;

من تمام السنة حب ابی حنیفة

ترجمہ: ''امام ابوحنیفہ ا سے محبت مکمل طور پر
اہل سنت میں سے ہونے کی علامت ہے''۔

(محدث ابراہیم بن معاویہ ا)

فہرست مضامین

2

J:\2009\ZamZam\Rah-e-Aetidal\1st Proof Contents-ok.........(15-06-09)

First Proof	15-06-09
Second Proof	00-00-00
FINAL	00-00-00
TOTAL-PAGE	

5

6

J:\2009\ZamZam\Rah-e-Aetidal\1st Proof Contents-ok.........(15-06-09)

First Proof	15-06-09
Second Proof	00-00-00
FINAL	00-00-00
TOTAL-PAGE	

8

;	دوہاتھوں سے بیعت	
;	بیعت میں بھی مصافحہ....................................	
;	مبہم روایات:...	
;	حدیث 1:..	
;	حدیث 2:..	
;	حدیث 3:..	
;	حدیث 4:..	
;	حدیث 5:..	
;	کلمۂ عدل	
;	دونوں طریقے ثابت ہیں	
;	دونوں ہاتھ سے مصافحہ افضل ہے	

[ ]

11

J:\2009\ZamZam\Rah-e-Aetidal\1st Proof Contents-ok.........(15-06-09)

First Proof	15-06-09
Second Proof	00-00-00
FINAL	00-00-00
TOTAL-PAGE	

حرفِ چند

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہِ الکریم.

اس دورِ پرفتن میں جب کہ سینکڑوں قسم کے فتنے مسلمانوں پر بارش کی طرح برس رہے ہیں اوراس کے معاشرہ کوگھن کی طرح کھارہے ہیں، ان میں ایک اہم ترین فتنہ ہمارے غیر مقلد بھائیوں (جو اپنے آپ کوبشمول اہل حدیث دسیوں ناموں سے موسوم کرتے ہیں) کے بے سروپا موشگافیوں کا ہے یہ حضرات چند نہایت ہی غیر اہم اور انتہائی فروعی مسائل کو ایمان واعتقاد کا درجہ دے کر ان کی بنیادوں پر حق و باطل اور توحید وشرک کو تقسیم کر کے برادرانِ اسلام بلکہ اکابر علماء کرام کی تضلیل وتکفیر میں مشغول ہیں اور ائمہ سلف خصوصاً امام اعظم ؒ اوران کی تحقیقات علمیہ پر نہایت رکیک تبصرے اور بازاری قسم کی تنقیدیں جاہل سے جاہل غیر مقلد کا محبوب پیشہ اور مشغلہ بنا ہوا ہے۔ براہِ راست سنے ہوئے چند جملے بطور عبرت درج کررہا ہوں:۔

''ائمۂ اربعہ کی تقلید صریح گمراہی ہے'' حنفی لوگ مدینہ جا کر مردے سے سفارش کراتے ہیں'' ''ہم ائمہ کا نام نہیں سننا چاہتے'' ''ائمہ کو برحق کہنے والے کو اپنے منہ کی طہارت لینی چاہیئے۔'' ''عبدالقادر جیلانی تو گمراہی پھیلانے کے لئے پیدا ہوا تھا'' ''تقلید تو کھلا شرک ہے'' ''مقلدین گمراہ اور اسلام سے خارج ہیں'' جو نمازیں حنفی طریقے پر پڑھی گئیں وہ سرے سے ادا ہی نہیں ہوئیں'' جب

تک ائمہ اربعہ کے مصلیٰ نہیں نکالے گئے حرم میں باطل گھسا ہوا تھا۔'' دو ہاتھ سے مصافحہ کرنے والا یہودی ہے۔'' ننگے سر نماز پڑھنا مردہ سنت کا احیاء ہے۔'' ''ائمہ اربعہ کے ماننے والے چار خدا کے قائل ہیں۔'' ''ابن مسعود کی تو بات چھوڑو، انہیں حافظہ ہی نہ تھا۔'' ''کسی کو مولانا کہنا حرام ہے''۔ ''درود شریف میں سیدنا کہنا حرام ہے''۔

یہ اور اسی قسم کی خدا جانے کتنی باتیں ہیں جو اب غیر مقلدین کے عامی سے عامی آدمی کی زبان پر بلا تکلف جاری ہیں، لطف یہ ہے کہ ان بیچاروں کی تحقیق کسی اصول پر مبنی ہے نہ تنقید کا کوئی دستور ہے اور نہ ہی علم میں کوئی تعمق و گہرائی ہے، لے دے کے چند مسائل ہیں جن کی اہمیت شرع میں ''بہتر'' اور ''کم بہتر'' سے زیادہ نہیں ہے (سوائے چند مسائل کے)۔

سوچنے کی بات ہے کہ فروع کو اصول کا درجہ دینا، سنت و مستحب چیزوں میں فرض و واجب جیسا تشدد کرنا اور اپنی ذہنی اُپج کے مقابلہ میں کبار علماء اور مجتہد ائمہ کی صاف و بے غبار تحقیقات کو غلط و بے بنیاد قرار دینا آخر کس دین و دیانت کا تقاضہ ہے؟

نیز ایک ایسے وقت میں جب اسلام دشمن قوتیں متحد و متفق ہو کر اسلامی تشخص و امتیاز اور مسلمانوں کے وجود ہی کے درپے ہیں اور اسلام کا مستقبل ایک گومگو کی کیفیت میں ہے، معمولی اور فروعی مسائل کے ذریعہ ملت اسلامیہ کے شیرازہ کو مزید بکھیرنا اور گھر گھر شقاق و اختلاف کا ماحول بنانا کس عقل کی دین اور کس مذہب کی تعلیم ہے؟

اس سے زیادہ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ بہ حیثیت مجموعی اس جماعت کے اصاغر و اکابر، عوام و علماء سب ایک ہی روش پر دکھائی دیتے ہیں۔

بڑوں میں اگر سنجیدگی ہوتی تو چھوٹوں میں یہ جرأت بے جا ہرگز نہ پیدا ہوتی۔

بفضلہ تعالیٰ ہمارے علماء دیو بند کا مزاج حتی المقدور تعمیری و اصلاحی جدو جہد میں لگے رہنے اور اختلافی امور میں تنقید ورد کی طرف بدرجۂ مجبوری اور سخت ضروری مواقع پر ہی اعتناء کرنے کا ہے...... آج کل چوں کہ یہ فتنہ تیزی سے پھیل رہا ہے، ضرورت کا تقاضہ ہے کہ بقدر ضرورت اس کی جانب توجہ دی جائے اور پوری سنجیدگی اور وقار علمی کے ساتھ اس کے فرو کرنے کی کوشش کی جائے، چنانچہ زیر نظر کتاب اسی کوشش کا ایک حصہ ہے۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی مدظلہ شیخ الحدیث دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد ریاست کی ایک اہم علمی شخصیت ہیں طبعی طور پر اختلاف سے دور اور بحث و مباحثہ سے نفور ہیں، لیکن غیر مقلدین کی موجودہ موشگافیاں اور زبان درازیاں و زیادتیاں اس حد تک پہنچ گئی ہیں کہ مولانا محترم نے اس وقت سکوت کو نا مناسب سمجھا اور محسوس فرمایا کہ ان نام نہاد الزامات کا تحقیقی جائزہ اور ان کی واقعیت و حقیقت کو عوام الناس کے سامنے اجاگر کر کے احقاق حق کے تقاضے کو پورا کیا جائے........... چنانچہ اس کتاب میں مولانا محترم زید مجدہ نے تقلید کی اہمیت و مشروعیت، امام اعظم ا کی دنیائے علم و تقویٰ میں علو مرتبت پر عالمانہ گفتگو کے علاوہ غیر مقلدین کے اٹھائے ہوئے چند معروف مسائل کا محققانہ جائزہ پیش کیا ہے........... ساتھ ہی تحریر میں عام مناظرانہ طرز سے احتراز کرتے ہوئے محض ناصحانہ و منصفانہ طریق کا اہتمام بھی کیا ہے۔ کیوں کہ مقصود حق کی وضاحت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

ہمیں امید بلکہ یقین ہے کہ یہ کتاب اس باب میں حق و انصاف کے مخلص متلاشیوں کے لئے نہایت مفید و مؤثر ثابت ہوگی بشرطیکہ ضد و تعصب سے آزاد ہو کر

کسی تحفظ ذہنی کے بغیر مطالعہ کیا جائے۔

مولانا محترم زید مجدہم مستحق شکریہ ہیں کہ ہم جیسوں کی درخواست پر انہوں نے اپنی تدریسی، انتظامی اور تصنیفی گوناگوں مشغولیات کے باوجود اس وقتی مسئلہ کو مقدم فرماتے ہوئے یہ گرانقدر تحریر مرتب فرمائی۔ دعا ہے کہ حق تعالیٰ انہیں اس کی بہترین جزاء عطا فرمائے اور اس کتاب کو شرف قبول عطا فرما کر اس کے نفع کو عام وتام فرمائے۔ (آمین)

محمد عبد القوی
ناظم ادارہ اشرف العلوم ایجوکیشنل سوسائٹی
حیدرآباد۔ اے، پی۔

[ ]

3

J:\2009\ZamZam\Rah-e-Aetidal\1st Proof Chp-1-ok.........(15-06-09)

سخنہائے گفتنی

دین کے احکام مجموعی طور پر چار طرح کے ہیں، ایک وہ جن کا تعلق عقیدہ اور ضمیر سے ہے، جن کو ماننے، تسلیم کرنے اور یقین کرنے پر ایمان کا مدار ہے۔ انہیں کو ’’اعتقادات‘‘ کہا جاتا ہے۔ توحید ورسالت، قرآن کی صداقت اور آخرت وغیرہ مسائل اسی قسم کے ہیں، جن میں ’’مصالحت‘‘ اور ’’لو‘‘ اور ’’دو‘‘ کی ادنیٰ گنجائش نہیں ہے، دوسرے وہ جن کا تعلق قلبی کیفیت، عادات اور برتاؤ سے ہے، ان کو ’’اخلاقیات‘‘ کہا جاسکتا ہے۔ مثلاً سچ بولنے، حسن سلوک کرنے، اتفاق، اتحاد اور عجز وانکساری اختیار کرنے اور جھوٹ بولنے، غیبت کرنے، کبر وتعلّی وغیرہ سے اجتناب کرنے کا حکم۔ تیسرے انسانی زندگی کے وہ عملی احکام جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کے یا اس کے بندوں کے حقوق سے ہیں، اور ان کو دین میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ مثلاً روزہ نماز، حج وزکوٰۃ کی فرضیت، قریبی رشتہ داروں سے نکاح کی ممانعت، طلاق کے ذریعہ رشتۂ نکاح کا خاتمہ، والدین کی حقوق اور زوجین کے اہم حقوق وغیرہ۔ حضور اکرم s نے اپنی بیعت میں خاص طور پر اس قسم کی باتوں کا عہد لیا ہے اور ان سے بے پروائی برتنے پر سخت وعیدیں بیان کی ہے .... دین وشریعت کے یہ تمام حصے بنیادی اہمیت کے حامل ہیں اور دین کے حدود اربعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید نے صریح الفاظ میں ان کو واضح کردیا ہے، متواتر حدیثیں ...... بے غبار کر کے ان کو بیان کرتی ہیں اور اسلام کے عہد اول سے آج تک مسلمانوں کے تعامل نے ان کی حقانیت، صداقت، اسلام میں ان کے ثبوت اور دین میں ان کی اہمیت کو اس قدر روشن

First Proof	15-06-09
Second Proof	05-08-09
FINAL	00-00-00
TOTAL-PAGE	

کردیا ہے کہ اس میں کسی کے لئے شک وشبہ کی ادنیٰ گنجائش باقی نہیں رہ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سنت والجماعت اور سلف صالحین کے درمیان ان مسائل میں کوئی اختلاف نہیں رہا ہے۔ کون ہے جس کو خدا کی توحید اور محمد s عربی فداہ روحی وابی کی رسالت سے اختلاف ہو؟ (العیاذ باللہ) سچائی کے قابل اجر ہونے اور جھوٹ کے نادرست ہونے پر کیا کبھی اتفاق رائے نہیں رہا ہے۔ اور کیا کسی نے نماز روزہ کی فرضیت سے بھی انکار کیا ہے؟

چوتھے قسم کے احکام وہ ہیں جو ان عملی احکام کی جزوی تفصیلات سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً نماز کے اوقات اور ان کے جائز ومستحب حصے، وضو کی سنتیں اور اس کے نواقض، نماز کے فرائض وسنن کا تعین، طلاق کی مختلف صورتیں اور اس کے اثرات ونتائج، دعاء کے آداب وغیرہ۔ اسی قسم کے احکام میں قرآنی آیات بہت کم ہیں، قرآن مجید نے عام طور پر اعتقادات، اخلاقیات اور زندگی کے مختلف شعبوں کی اصولی احکام ہی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ متواتر حدیثیں جن کو ہر زمانہ میں امت کی ایک بہت بڑی جماعت نقل کرتی آئی ہے، بھی اس باب میں بہت کم ہیں اور اہل علم اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔

ان مسائل میں اکثر وبیشتر دلائل ایسے ہیں جن میں ہمیں اپنے قصور فہم کی وجہ سے ''بظاہر'' اختلاف سا محسوس ہوتا ہے اور کتاب وسنت کی تصریحات اس باب میں اس قدر واضح نہیں ہیں کہ ان میں قطعی طور پر ایک ہی رائے قائم کر کے اس پر اصرار اور دوسروں کی رائے سے اختلاف اور اس سے مکمل انکار کو درست کہا جا سکے، دلائل میں اختلاف مختلف وجوہ سے پیدا ہوتا ہے۔ کبھی ''لفظ'' ایک ہی ہوتا ہے مگر خود اس ایک لفظ کے اندر ایک سے زیادہ مفہوم کی گنجائش رہتی ہے، مثلاً وَامۡسَحُوۡا بِرُءُوۡسِکُمۡ (المائدہ: ٦) اس میں عربی قواعد کے لحاظ سے پورے سر کا مفہوم بھی اخذ کیا جا سکتا ہے اور سر کے کچھ حصہ کا بھی، کہیں ایک حکم کی صراحت موجود ہوتی ہے، اور اس پر اتفاق بھی ہوتا ہے لیکن اس کا سبب

متعین کرنے اور دوسرے مواقع پر اس کی روشنی میں مسائل حل کرنے میں رائے اور نقطۂ نظر کا اختلاف ہوجاتا ہے، کبھی حضور اکرم s نے ایک ہی کام دو طریقوں سے انجام دیا ہوتا ہے۔ جس راوی نے آپ s کا جو طریقہ دیکھا اسے نقل کرتا ہے اور جن لوگوں تک حدیث ان کے ذریعہ پہونچتی ہے وہ اس کو اختیار کرتے ہیں، حالانکہ منشائے رسالت یہ ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں توسع سے کام لیا جائے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حضور s نے ایک عمل ابتداء میں کیا، بعد کو اس حکم میں تبدیلی کی گئی، اَب چوں کہ مجتہد تک قطعی طور پر یہ بات نہیں پہونچ پائی کہ ان میں سے کون سا عمل آپ کا پہلا عمل ہے اور منسوخ ہے اور کون سا عمل بعد کا ہے اور ناسخ ہے؟ اس کے تعین میں اختلاف رائے پیدا ہوجاتا ہے۔ کبھی روایات میں ترجیح کے لئے الگ الگ معیار ہوتے ہیں۔ ایک فقیہ اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ایک روایت کو راجح سمجھتا ہے اور دوسرا اس کو مرجوح۔

اس لئے ان مسائل میں اختلاف بالکل فطری امر ہے اور چوں کہ یہ اختلاف اجتہاد واخلاص، حق کی تلاش وجستجو اور سنت نبوی s کی اتباع وپیروی کی بنیاد پر ہے اور دین کے حدود اربعہ اور کتاب وسنت کے چوکھٹے میں رہتے ہوئے ہے، اس لئے قطعاً مذموم نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ سے آنحضور s کی مختلف سنتیں اور مختلف طریقے زندہ ہوتے ہیں۔ اور وہ عملی زندگی میں جگہ پاتے ہیں، وہ تنگی کے وقت یسر وسہولت کا سامان بنتے ہیں، اگر دین میں یہ بات مطلوب ہوتی کہ ان مسائل میں امت مسلمہ کے درمیان سر مو اختلاف نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کے لئے کیا دشوار تھا کہ وہ توحید ورسالت اور اقامت صلوٰۃ وایتاء زکوٰۃ کے متعلق صریح وواضح ہدایات کی طرح امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے اور نہ پڑھنے اور رفع یدین کرنے اور نہ کرنے اور آمین کے بالجہر یا بالسر کہنے کی بابت بھی اپنی کتاب میں ''قول فیصل'' نازل فرما دیتا، یا اسکی قدرت ان مسائل کو بھی ہم تک اسی تواتر سے پہنچا دیتی جس تواتر کے ساتھ ہم کو نماز کی رکعات کا علم ہے۔ اس قسم کے مسائل کو دین کے بنیادی احکام کا درجہ دیدینا، ان کو بحث ومناظرہ اور فتنہ وجدال کا موضوع بنا دینا

اوران میں حق وباطل کی طرح جوش وخروش کا مظاہرہ، دین میں نسبتاً کم اہم بات کو زیادہ اہمیت دینے کے مترادف اور ایک فتنہ خیز اور تفرقہ انگیز بدعت اور احداث فی الدین ہے اور وہ لوگ جو اپنے آپ کو نہ صرف توحید کا داعی سنت رسول s کا محافظ اور بدعت کا ماحی وقامع قرار دیتے ہیں بلکہ کسی اور جماعت کو ان امور میں اپنا شریک وسہیم تسلیم کرنا بھی جن کو گراں خاطر ہے، ان سے ایسی باتوں کا ارتکاب کسی عجوبہ سے کم نہیں ہے۔

مہبط وحی رسول اللہ s کے بعد دین وشریعت کے منشاء وروح سے سب سے زیادہ واقف صحابۂ کرام تھے، خود حضور s نے صحابہ کا طریقہ اختیار کرنے کا حکم فرمایا ہم دیکھتے ہیں کہ اس قسم کے مسائل میں خود صحابہ p کے درمیان اختلاف موجود تھا، حضرت ابوہریرہ r کا خیال تھا کہ آگ میں پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، عام صحابہ اس کے قائل نہ تھے، حضرت عبداللہ ابن عباس q عیدین میں ہر رکعت میں نو نو دفعہ تکبیر زوائد کے قائل تھے، بعض صحابہ تین تین دفعہ کے اور بعض اس سے زیادہ کے، حضرت عائشہ R اس بات کو ضروری نہیں سمجھتی تھی کہ عورتیں غسل میں اپنی چوٹیاں کھولیں، جب کہ حضرت عبداللہ بن عمر r اس کو ضروری جانتے تھے، حضرت ابوہریرۃ r اور عبداللہ بن عمر r کا خیال تھا، کہ عرفات سے واپسی میں آپ s کا مقام ابطح پر اترنا از راہ عبادت تھا، حضرت عائشہ R اور حضرت عبداللہ بن عباس q اس کو صرف ایک اتفاقی بات کہتے تھے، کسی کا شوہر غائب اور لاپتہ ہوجائے تو حضرت عمر r کی رائے تھی کہ چار سال انتظام کے بعد اس کا نکاح توڑ دیا جائے جب کہ حضرت علی r کا خیال تھا کہ جب تک مرد کی موت کی تحقیق نہ ہوجائے عورت اسی حال میں رہے اور دوسرا نکاح نہ کرے لیکن اس کے باوجود یہ تمام صحابہ p ایک دوسرے کو مخلص بھی سمجھتے تھے، باہم ایک دوسرے کا احترام واکرام بھی کرتے تھے اور یہ اختلاف کبھی ایک دوسرے پر طعن وتشنیع کا سبب بھی نہ بن پاتا تھا، وہ ایک دوسرے کے پیچھے بلا تامل نماز بھی

ادا کرتے تھے اور مسائل میں ایک دوسرے کی طرف رجوع بھی فرماتے تھے۔

یہی حال تابعین اور سلف کا رہا ہے، انہوں نے اس اختلاف کو کبھی نزاع وجدال کا سبب بننے نہیں دیا۔ امام سفیان ثوری ا ایسے اختلافی مسائل کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ یہ نہ کہو کہ علماء نے ان مسائل میں اختلاف کیا ہے بلکہ یہ کہو کہ امت کے لئے توسع اور فراخی پیدا کی ہے: **لا تقولوا اختلف العلماء فی کذا وقولوا قد وسع العلماء علی الامۃ بکذا**

وہ سمجھتے تھے کہ ان مسائل میں اختلاف امت کے لئے چنداں مضر نہیں۔ اسی لئے امام مالک ا نے خلیفہ ہارون الرشید کو اس بات سے منع کردیا کہ ان کے مجموعہ حدیث ''مؤطا امام مالک'' پر جبراً تمام مسلمانوں سے عمل کرایا جائے۔

دین کی روح اور اس کے مزاج ومذاق سے واقفیت نے ان کے ان کے اندر رواداری اور فراخدلی پیدا کردی تھی، امام احمد پچھنا لگانے کو ناقض وضو سمجھتے تھے۔ امام مالک ا اور سعید بن میسّب ا کا خیال تھا کہ اس سے وضو نہیں ٹوٹ، امام احمد ا سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی شخص پچھنا لگائے اور وضو کئے بغیر نماز کو کھڑا ہوجائے تو کیا آپ ا اس کی اقتداء کریں گے؟ امام احمد ا نے کہا کیوں نہیں؟ کیا میں امام مالک ا کے پیچھے نماز نہیں پڑھوں گا؟ امام ابوحنیفہ ا کے نزدیک خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، خلیفہ ہارون نے امام مالک ا کے مسلک پر عمل کرتے ہوئے پچھنا لگوانے کے بعد امامت کی اور وضو نہیں کیا، امام ابویوسف ا نے ان کی اقتداء میں نماز ادا کی اور کہا کہ آج میں نے اپنے بھائی ''اہل مدنیہ'' کی رائے پر عمل کیا ہے۔ امام شافعی ا بغداد آئے جہاں امام ابوحنیفہ ا کی قبر ہے تو نماز فجر اس طرح ادا کی کہ دعاء قنوت نہیں پڑھی، حالاں کہ وہ نماز فجر میں دعاء قنوت کے قائل

المیزان الکبریٰ ۲۸/۱۔

ہیں اور امام ابوحنیفہ I کی قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ مجھے اس قبر والے سے شرم آتی ہے کہ یہاں آ کر بھی ان کی مخالفت کروں؟

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ سنجیدہ اور اہل علم ہوں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو دین کے فہم کا کوئی حصہ عطا کیا ہو وہ اس قسم کے مسائل میں سلف صالحین پر طعن و تشنیع اور ان کے اثبات یار میں تشدد وغلو کر ہی نہیں سکتے، حافظ ابن تیمیہ I (ہمارے غیر مقلد بھائی عملاً جن کی تقلید کرتے ہیں) خود ان کی اس وضاحت میں کس قدر اعتدال ہے:

فان السلف فعلوا هٰذا وهٰذا .... كانوا يصلون تارةً بالجهر بالبسملة وتارةً بغير جهر وتارةً باستفتاح وتارةً بغير استفتاح وتارةً برفع اليدين فى المواطن الثلاثة وتارةً بغير رفع وتارةً يسلمون تسليمتين وتارةً تسليمة واحدة وتارةً يقرء ون خلف الامام بالسر وتارةً لا يقرء ون وتارةً يكبرون على الجنازة سبعًا وتارة اربعًا كان فيهم من يفعل هٰذا وفيهم من يفعل هٰذا كل هٰذا ثابت عن الصحابة ...... وكلاهما ثابت عن النبى s.

ترجمہ: سلف صالحین نے ایسا بھی کیا ہے اور ایسا بھی .... وہ کبھی نماز میں زور سے بسم اللہ کہتے ہیں اور کبھی آہستہ، کبھی ثناء پڑھتے اور کبھی نہیں پڑھتے، کبھی تین مواقع پر رفع یدین کرتے کبھی نہیں، کبھی دو سلام پھیرتے کبھی ایک ہی پر

حضرت شاہ ولی اللہ I نے ''الانصاف فی سبب الاختلاف'' میں اس طرح کے قول جمع کئے ہیں۔

مجموعہ الرسائل الکبریٰ فصل ۱۳۔

اکتفاء کرتے، کبھی امام کے پیچھے قرأت کرتے، کبھی نہیں کرتے، کبھی جنازے پر سات تکبیرات کہتے، اور کبھی چار، ان میں بعض لوگ اس طرح عمل کرتے اور بعض اس طرح، یہ تمام باتیں صحابہ r سے ثابت ہیں، اور یہ مختلف طریقے رسول اللہ s سے منقول ہیں۔

اس طرح غیر اہم بحثوں میں خود الجھنا یا دوسروں کو الجھانا قوم وملت کے لئے زبردست نقصان اور خسارہ ہے، اس سے فرقہ بندی بڑھتی ہے، اس سے اختلاف وانتشار کو ہوا ملتی ہے جو یقیناً گناہ ہے اور اس سے واقعی اور ضروری مسائل کی طرف سے بے توجہی پیدا ہو جاتی ہے، اس لئے تجربہ ہے کہ اس قسم کا مذاق رکھنے والے لوگ مسلمانوں کی دینی حالت کی اصلاح، عبادات کی طرف دعوت، معاشرہ اور معاملہ کی اصلاح، قوم کی ٹھوس تعمیری خدمت، غیر مسلموں میں دعوت اسلام وغیرہ کے کام بالکل نہیں کر پاتے اور ان کا جوش جنوں اور جذبۂ اصلاح ''قرأت فاتحہ'' اور ''رفع یدین'' وغیرہ کے مسائل سے آگے گذر کر برف کی طرح جم کر رہ جاتا ہے۔ ہم جب حضور اکرم s کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہاں دین کے بنیادی ارکان توحید، نماز، روزہ اور حج وزکوٰۃ کی دعوت ہوتی ہے اور انہیں کی بیعت لی جاتی ہے مگر اس طرح کے غلو کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان ارکان خمسہ کے بجائے ہماری مساعی کا نقطۂ آغاز امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی قرأت، رفع یدین، آمین بالجہر، ایک ہاتھ سے مصافحہ اور اس طرح کے مسائل سے ہوتی ہے۔ **فيا عجباه ويااسفاه.**

اس غلو کا سب سے بڑا افسوسناک بلکہ خطرناک پہلو صحابہ p کے اسوۂ وآثار اور ان کے طریق زندگی اور تعامل سے بے نیازی بلکہ ایک درجہ میں اتباع سنت کے نام پر اس کا انکار اور اس سے بے نیازی و بے اعتنائی ہے، یہ عاشقان توحید، حامیان سنت اور ماحیان بدعت حضرت عمر r وعثمان r کی طرف بدعت کی نسبت کرنے میں بھی کوئی تأمل نہیں کرتے، تراویح کی ۲۰ رکعتیں ''بدعت

عمری'' ہیں اور جمعہ کی اذانِ ثانی ''بدعت عثمانی'' ہے اور عبد اللہ ابن مسعود r کی روایات چوں کہ فقہ حنفی کے لئے اساس کی حیثیت رکھتی ہے، اس لئے اس کا احتساب تو گویا ان کا خاص کار ثواب ہے کہ آخر اس کے بغیر فقہ حنفی کو مجروح کس طرح کیا جا سکے گا؟

کاش! وہ اس حقیقت کو سمجھتے کہ خلفاء راشدین اور اصحابِ رسول s کی سنتوں کی پیروی اور ان کے اسوہ کو مشعل راہ بنانے کا حکم بھی اسی حدیث سے ثابت ہے جس کا متبع وہ اپنے آپ کو قرار دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود r ان صحابہ p میں ہیں جن کو حضور s کی بارگاہ میں خاص مقام حاصل تھا، جو ابتداء اسلام قبول کرنے والوں میں ہیں جن کو دو بار حبش اور ایک بار مدینہ منورہ ہجرت کرنے کا شرف حاصل ہے جو غزوۂ بدر میں شریک رہے ہیں۔ خود آپ s نے لوگوں کو ان سے قرآن سیکھنے کا حکم دیا۔ صحابہ p ان کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ حضرت عمر r نے جب ان کو کوفہ بھیجا تو اہل کوفہ کو لکھا کہ ابن مسعود r کو بھیج کر میں ایثار سے کام لے رہا ہوں۔ جن کو آپ s سے اس قدر قرب تھا کہ وہ آپ s کے بستر، تکئے، وضو کا پانی اور نعلین وغیرہ کے ذمہ دار سمجھے جاتے تھے، حضرت علی r نے فرمایا: ابن مسعود r کے اصحاب اس امت کے چراغ ہیں، **اصحاب ابن مسعود سرج ھٰذہ الامۃ.**

بحیثیت مجموعی صحابہ یا کسی خاص صحابی کی ادنیٰ ہتک شان ایک خطرناک بات ہے اور آخرت کے لئے سخت خسارہ کا باعث ہے، ہم نے اپنے بزرگوں (علماء دیوبند) کو دیکھا ہے کہ تقلید اور ایک صحابی کے قول کو دوسرے صحابی کی رائے پر ترجیح دینے کے باوجود نہ صرف صحابہ بلکہ بعد کے بزرگوں کے احترام اور ان کی عظمت کا بھی اس قدر خیال رکھا جاتا ہے جس طرح کہ خود اس امام کا جس کے وہ مقلد ہیں، مولانا رشید احمد

گنگوہی l کے سوانح نگار نے نقل کیا ہے کہ ان کے درس میں اگر کوئی طالب علم کسی محدث پر اعتراض کرتا تو خفگی کا اظہار کرتے اور دلائل کی اس طرح تشریح فرماتے کہ ان کا مسلک ہی قوی محسوس ہوتا۔ ایک دفعہ احناف کی کسی رائے کی توجیہ میں حضرت شوافع l کی کسی دلیل کا ایسا دلپذیر جواب دیا کہ ایک صاحب کہہ اٹھے اگر امام شافعی l زندہ ہوتے تو وہ بھی آج رجوع کر لیتے۔ مولانا گنگوہی کو ان کی یہ بات ناگوار گذری اور فرمایا کہ اگر امام شافعی l زندہ ہوتے تو میرا یہ اعتراض محض ایک طالبعلمانہ اعتراض ہوتا، صحابہ اور خیر القرون کے اختلاف کے بارے میں تمام ہی سلف صالحین کا یہی طریق رہا ہے۔ خود امام ابن تیمیہ l فرماتے ہیں:۔

لایجوز لاحدان یظن بالصحابة انهم بعد رسول الله اجمعوا علٰی خلاف شریعة بل هٰذا من اقوال اهل الالحاد.

ترجمہ: کسی کے لئے صحابہ r کے متعلق یہ گمان رکھنا جائز نہیں کہ وہ آپ s کے بعد شریعت کی خلاف ورزی پر متفق ہو گئے تھے، بلکہ اس طرح کی بات ملحدین ہی کہہ سکتے ہیں۔

امام ابو حنیفہ l کو مطعون کرنا ہمارے یہ بھائی عین تقاضائے ایمان تصور کرتے ہیں، حالانکہ ان سے متعدد روایات براہِ راست صحابہ p سے منقول ہیں، حافظ جلال الدین سیوطی l نے امام ابو حنیفہ l کے مناقب پر اپنی تالیف ''تبییض الصحیفہ'' میں ایسے چھ صحابہ کا ذکر کیا ہے، بعض حضرات نے ان کے علاوہ دوسرے صحابہ سے بھی آپ کا سماع ثابت کیا ہے، گو ان روایات کا مستند ہونا محدثین کے نزدیک مسلمہ نہیں ہے، تاہم صحابی کی

فتاویٰ ابن تیمیہ l ۳۶/۳۳۔

زیارت اوران سے ملاقات کا شرف حاصل ہونا یقینی ہے، اوراسی لئے حافظ ذہبی وغیرہ نے آپ ا کے تابعی ہونے کا اقرار کیا ہے............اس کے علاوہ اکابر محدثین نے نہایت فراخ دلی کے ساتھ آپ کی عظمت، جلالت علم، ورع وتقویٰ، فہم وفراست اوراحتیاط کا اعتراف کیا ہے۔

امام ابوحنیفہ ا کی علمی عظمت کے لئے یہی کافی ہے کہ امام شعبی، ابراہیم نخعی، حماد بن سلیمان، ابواسحاق سبیعی، حسن بصری، عکرمہ، عطا M جیسے لوگ آپ ا، کے اساتذہ ہیں اور یحییٰ بن معین، وکیع بن الجراح، عبداللہ بن مبارک، مکی ابن ابراہیم، امام ابو یوسف، اور امام محمد، جیسے لوگ آپ، کے براہ راست اور امام بخاری، اور امام شافعی، اور امام احمد M، آپ کے بالواسطہ شاگردوں میں ہیں۔بعض ناواقف خدا ناترس کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ ا کوصرف ١٦۔١٧ احادیث ہی یاد تھیں۔ یہ نہ صرف امام صاحب کے ساتھ بلکہ تاریخ کے ساتھ بھی ظلم ہے، غیر مقلدوں کے یہاں یہ ایک زبان زد فقرہ ہے جو آپ ا پر بہتان عظیم ہے، امام صاحب ا کی مسانید حدیث جن میں آپ کے تلامذہ نے آپ کی مرویات کو جمع کیا ہے، ان کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے، امام صاحب کی روایات کے ہم معنی اور موافقات جو صحاح ستہ میں ہیں۔ علامہ مرتضیٰ زبیدی ا نے ان کو "**عقود الجواهر المنيفة فى ادلة مذهب الامام ابى حنيفة مماوافق فيه الائمة الستة او احدهم**" کے نام جمع کردیا ہے، جن میں ایسی موافق روایات کے عنوانات ٣٧٣، ہیں، (مطبوعہ: مطبع شبکشی ازہر مصر ١٣٨٢ ہجری) جن سے اندازہ ہے کہ کم از کم ٣٧٣ روایات تو آپ کی وہ ہیں جو صحاح منقول ہیں، رہ گئی بات کہ صحیحین (بخاری ومسلم) میں امام صاحب ا کی سند سے کوئی روایت ذکر نہیں کی گئی ہے تو اس سے امام صاحب کے مقام ومرتبہ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، بخاری نے امام شافعی ا سے بھی کوئی روایت

نہیں لی ہے، امام مالک ا اور امام احمد ا سے بھی چند ہی روایات لی ہیں، البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ امام بخاری ا کی اکثر "ثلاثیات" مکی ابن ابراہیم سے مروی ہے جو امام صاحب ا کے شاگرد ہیں۔اوراپنے استاذ کی مدح میں رطب اللسان ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ بعض حضرات نے تعصب یا ناواقفیت اور غلط فہمی کی وجہ سے امام صاحب ا کی ثقاہت پر تنقید بھی کی ہے مگر آپ ا کے مداحوں کے مقابلہ میں وہ بالکل نا قابل اعتناء ہے، یہ کچھ مجہول اور شاذ اقوال کو بنیاد بنا کر پروپیگنڈہ کرنا دراصل اولیاء اللہ سے کدورت کی علامت ہے۔ محدثین کے نزدیک یہ ایک تسلیم شدہ قاعدہ ہے کہ فقہاء متبوعین اور ائمہ مقبولین کے خلاف جرح کا اعتبار نہیں۔حقیقت یہ ہے کہ اگر اس اصول کو نظر انداز کردیا جائے تو اکابر محدثین ضعیف اور نا قابل اعتبار قرار پا جائیں گے، اس لئے کہ شعبی ا نے ابراہیم نخعی کو امام زہری ا نے امام ربیعۃ الرأی کو امام مالک ا نے ابن اسحاق کو، یحیٰ بن معین نے امام شافعی ا کو، ابن ابی ذئب وغیرہ نے امام مالک ا کو، ابن حزم نے ترمذی اور نسائی کو اور امام ذہلی نے بخاری ا کو مجروح قرار دیا ہے، کیا ان تمام ائمۃ المسلمین اور فقہاء ومحدثین کو یک قلم نامعتبر قرار دیا جائے گا..................؟

غیر مقلد حضرات کی طرف سے یہ بات مشہور کی جاتی ہے کہ حنیفہ قیاس ورائے کو حدیث پر ترجیح دیتے ہیں۔ جولوگ یہ کہتے ہیں وہ درحقیقت انصاف کا خون کرتے ہیں، شیخ ابن عربی نے فتوحات مکیہ میں امام ابوحنیفہ ا سے نقل کیا ہے:

ايـاكـم والـقـول فـى الـديـن بالراى وعليكم بالكتاب وعليكم بالسنة ومن خرج عنها ضل.

ترجمہ: دین میں محض رائے زنی سے گریز کرو، تم پر کتاب اللہ اور سنت رسول s کی پابندی واجب ہے کہ جو ان حدود سے نکلا وہ گمراہ ہو گیا۔

آپ ا حدیث پڑھ رہے تھے، ایک شخص آیا اور کہنے لگا مجھے ان حدیثوں سے باز رکھو، امام صاحب ا اس پر سخت برہم ہوئے اور فرمایا: اگر سنت نہ ہوتو ہم قرآن بھی نہ سمجھ سکیں: ''لو لا السنة مافهم احدمنا القراٰن'' خود امام ابوحنیفہ ا سے ان کا طریق اجتہاد استنباط ان الفاظ میں مروی ہے:

انا نعمل اولاً بكتاب الله ثم بسنة رسول الله ماجاء عن رسول اللّٰه فعلى الرأس والعين بابى هو وامى وليس لنامخالفته وما جاء نا عن اصحابه تخيرنا وما جاء عن غيرهم فهم رجال ونحن رجال.

ترجمہ: ہم اوّلاً کتاب اللہ پر عمل کرتے ہیں پھر سنت رسول s پر......اور جو کچھ رسول اللہ کی طرف سے آئے وہ سر آنکھوں پر ہے آپ s پر میرے ماں باپ قربان ہوں، ہمیں آپ s کی مخالفت کا حق نہیں، پھر آپ s کے صحابہ سے اقوال مروی ہوں تو ہم ان میں کسی کو ترجیح دیتے ہیں اور منتخب کرتے ہیں اور رہے صحابہ کے علاوہ دوسروں کے اقوال تو وہ بھی آدمی ہیں اور ہم بھی۔

افسوس کہ امام ابوحنیفہ ا کی ایسی ایمان افروز صراحتوں کے باوجود کچھ لوگ ہیں جو ان پر بہتان لگا کر اپنی عاقبت خراب کرنے ہی پر تلے ہوئے ہیں والی اللّٰہ المشتکی. نامناسب نہ ہوگا کہ اس موقع پر امام ابوحنیفہ ا کے بارے میں امام عبدالوہاب شعرانی شافعی کے چند فقرے نقل کردوں۔

''میں نے اپنی کتاب ''ادلۃ المذاہب'' کی تالیف کے وقت بحمد اللہ امام ابوحنیفہ

المیزان الکبریٰ ۷۱/۱۔

ان کے اصحاب اور متبعین کے اقوال و خیالات کی جستجو کی اور کوئی رائے ایسی نہیں پائی جس کے لئے کوئی آیت، کوئی حدیث، صحابہ کا اثر، آیات و احادیث بالواسطہ اخذ کیا ہوا مضمون (مفہوم) حدیث ضعیف جو مختلف سندوں سے منقول ہے (کہ کثرت طرق سے ضعیف روایت بھی اہل فن کے یہاں قابل قبول ہو جاتی ہے) یا صحیح بنیادوں پر صحیح قیاس موجود نہ ہو جو اس سے واقف ہونا چاہے وہ میری مذکورہ کتاب کا مطالعہ کرے۔''

یہ تمہیدی سطریں اس لئے لکھی گئی ہیں کہ اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ چند جزوی مسائل کے متعلق جن میں عموماً سلف کے درمیان محض افضل اور غیر افضل کا اختلاف رہا ہے، یہ سمجھا جائے کہ کونسی رائے قابل ترجیح ہے، بلکہ سوال یہ ہے کہ دین نے ایسے مسائل کی بابت کیا مزاج بنایا ہے؟ اور ان پر غور و فکر اور بحث و تحقیق کا کیا طریقہ ہونا چاہیے؟ ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کو امت کے درمیان تفرقہ اور انتشار کا سبب بنالیا جائے، حق و باطل کے تصور کے ساتھ ان پر گرم جوش بحث کی جائے، ملت کا رخ انہیں کی مسائل کی تحقیق کی طرف موڑ دیا جائے، پھر اس اختلاف میں شدت کی وجہ سے سلف صالحین سے بدگمانی پیدا ہو، یہ رفتہ رفتہ زبان طعن اور قلم دشنام کو بولنے اور لکھنے کا موقع دے؟ اور غیر مقلد بھائیوں نے بحیثیت مجموعی دانستہ یا نادانستہ یہی راہ اختیار کی ہوئی ہے۔

دوسری راہ یہ ہے کہ ان جزوی مسائل کو توسع و فراخی کا سبب بنایا جائے، ان مباحث میں غلو و تعمق سے امت کو روکا جائے، سلف کے اخلاص تفقہ پر اعتماد برقرار ررکھا جائے اور ان کے احترام و عظمت کا انکار نہ ہو بلکہ اعتراف و امتنان ہو، یہی راہ ہے کہ جس کی ہم دعوت دینا چاہتے ہیں، ضرورت ہے کہ مسلمان اس صورت حال پر گہری نظر سے غور کریں اور ہمارے غیر مقلد بھائی بھی اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کریں، کاش جو محنت وہ ان مسائل میں بحث و مناقشہ اور مقلدین کو غیر مقلدیت کی طرف

المیزان الکبریٰ ۷۰/۱۔

دعوت وترغیب میں صرف کرتے ہیں اس کا دسواں حصہ بھی مسلم معاشرہ کی اصلاح، ان کو بنیادی دینی باتوں سے واقف کرنے اور غیر مسلموں میں اسلام کی سادہ تعلیمات کی اشاعت وتبلیغ میں صرف کرتے!۔

اس کتاب میں چند مسائل پر اختصار کے ساتھ جو بحث کی گئی ہے اس کا منشاء صرف یہ بتانا ہے کہ سلف صالحین L کے درمیان ان مسائل کی بابت جو اختلاف رہا ہے وہ سبھی مبنی بر دلیل ہے، نیز احناف نے جو رائے اختیار کی ہے وہ بھی قوی دلیل سے ثابت ہے، عام پڑھے لکھے لوگ اس پروپگنڈے سے متأثر نہ ہوں کہ احناف کے پاس حدیث نہیں ہے۔

اسی مقصد کے تحت اس کتاب میں ......نماز میں قیام کی حالت میں ہاتھ کہاں باندھا جائے؟ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ، رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد رفع یدین، آمین زور سے کہی جائے یا آہستہ؟ مردوں اور خواتین کی نماز میں فرق، ایک مجلس کی تین طلاقوں کا متفق علیہ مسئلہ اور مصافحہ کا مسنون طریقہ...... پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، اور حقیقت حال کو واضح کیا گیا ہے تاکہ لوگوں کو غلط فہمی سے بچایا جاسکے۔ ان مسائل کے ساتھ ''مساجد میں خواتین کی نماز'' کے مسئلہ پر راقم الحروف کا ایک فتویٰ بھی شریک اشاعت ہے۔

ان مسائل سے پہلے خود تقلید کی حقیقت اور اس کی اہمیت وضرورت پر ایک مختصر تحریر بھی شامل ہے، اس میں راقم الحروف نے معروف عالم ''مولانا سرفراز صفدر صاحب'' کی ''الکلام المفید'' سے بھی استفادہ کیا ہے، جو حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان میں ''تقلید'' اور غیر مقلدین کے ابھارے ہوئے مسائل کی وضاحت اور اس کی حقیقت جاننے کے لئے نہایت مفید اور لائق مطالعہ کتاب ہے............

چوں کہ غیر مقلد بھائیوں کی ایک مستقل مہم استاذ المحدثین سید الفقہاء، سند المتکلمین امام اعظم ابوحنیفہ I کی ذات گرامی ہے، جن سے بغض

وتکدر کو سلف صالحین نے بدعتی یا رافضی ہونے کی اور جن سے محبت اور حسن ظن کو اہل سنت میں ہونے کی علامت قرار دیا ہے، اس لئے ایک مختصر تحریر خود امام ہمام کے بارے میں بھی اس مجموعہ میں شامل ہے تاکہ بہتان اور سوءظن کے گناہ سے ان بھائیوں کو بچایا جاسکے۔

اخیر میں عرض ہے کہ میں اس طرح کی تحریروں کا مزاج نہیں رکھتا اور حتی المقدور ایسے موضوع پر قلم اٹھانے سے گریز کرتا ہوں جس سے امت میں اتحاد کی بجائے اختلاف اور اتفاق کے بجائے شقاق پیدا ہو، فاصلے سمٹنے کے بجائے بڑھیں اور دل جُڑنے کے بجائے ٹوٹیں ہندوستان میں مسلمان اس وقت جن حالات سے دوچار ہیں بلکہ پوری دنیا میں امت مسلمہ جیسے چومکھے حملوں کا نشانہ ہے اس وقت صحیح طریقہ یہی ہے کہ ایسے موضوعات کو نہ چھیڑا جائے اور زبان وقلم کو احترام ومحبت کا پیغامبر بنایا جائے۔

مگر افسوس! اور صد افسوس کہ ہمارے غیر مقلد بھائیوں کو شاید اس نزاکت اور امت کی اس دشواری کا کوئی احساس نہیں، انہوں نے چند فروعی اور جزوی مسائل کو مقصد زندگی بنالیا ہے گویا حضور s کی بعثت مبارکہ......خاص انہیں مسائل کے لئے ہوئی تھی، میں اپنے ایک غیر مقلد عالم دوست کو مزاحاً کہا کرتا ہوں کہ حضور s نے تو شہادت توحید ورسالت، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ پر بیعت لی تھی لیکن اگر تم لوگ بیعت لو تو شاید قرأۃ فاتحہ خلف الامام، رفع یدین، آمین بالجہر اور سینہ پر ہاتھ باندھنے پر بیعت لوگے اور ایک مجلس کی تین طلاقوں پر بیعت ختم کروگے۔

ہندوستان میں بھی ایک زمانہ میں اس طرح کے مسائل پر مناظروں کی گرم بازاری تھی لیکن حالات نے مسلمانوں کو تعمیری رخ پر سوچنے پر مجبور کردیا اور وہ اختلاف رائے کے باوجود اتحاد اور باہمی احترام کی راہ پر چلنا سیکھنے لگے تھے،

لیکن ادھر غیر مقلد حضرات نے ایک مہم سی چلا رکھی ہے، شہر شہر اور گاؤں گاؤں ائمہ کے بارے میں اہانت آمیز تبصرے فقہ کی کتابوں کے بارے میں اپنی کوتاہ علمی اور بے بصیرتی کی وجہ سے نازیبا ریمارک، مقلدین کی تفسیق بلکہ تکفیر، اپنے بارے میں خوش فہمی اور خود فریبی کہ ہم سب سے متبع سنت اور موحد ہیں، رسول اللہ s کی ان سنتوں سے بے نیازی جن میں کوئی اختلاف نہیں، اباحیت پر مبنی فتاویٰ مثلاً یہ کہ جن نمازوں کو ادا نہیں کیا ہے، ان کی قضا واجب نہیں، یا یہ کہ جو مقلد تین طلاق ایک مجلس میں دے چکا ہو، اس کی طلاق کو ایک ہی قرار دینا حالاں کہ یہ احادیث صحیحہ ثابتہ اور عہد صحابہ p سے آج تک کے بزرگان اہل سنت کے فتاویٰ کے مطابق تین طلاقیں ہیں اور خود غیر مقلدوں کے شیخ الکل فی الکل شاہ نذیر حسین محدث سے منقول ہے کہ اگر کوئی شخص تین طلاقیں دیتے وقت حنفی تھا اور بعد کو غیر مقلد ہو جائے تو طلاقیں تین ہی شمار کی جائیں گی لیکن آج کل کے غیر مقلدین نے اس کو اپنے ''مذہب'' کی تبلیغ کو گویا ذریعہ بنا لیا ہے۔

غیر مقلدیت میں اس غلو نے ہمارے بہت سے بھائیوں کو انکار حدیث کی دہلیز پر چڑھا دیا ہے، بعض حضرات عذاب قبر سے انکار کرنے لگے ہیں، بعضوں کا کہنا ہے کہ قبرستان میں ''**السلام علیکم یا اهل القبور**'' کہنا بدعت اور ناجائز ہے، ایک صاحب کہنے لگے کہ یہ بات کہ حضور s قیامت کے دن تمام امتوں کے لئے شفاعت کریں گے اور ہر پیغمبر اپنی امت سے شفاعت کے سلسلہ میں معذرت کر دیں گے، بالکل غیر درست بات معلوم ہوتی ہے حالانکہ خود بخاری میں یہ روایت موجود ہے، اب کچھ لوگ حضور s کے ''افضل الانبیاء'' ہونے اور آپ s کو ''سید المرسلین'' کہنے پر بھی خفا ہیں۔ یہ سب آنکھوں دیکھی باتیں ہیں، ان کو دیکھ کر اس بات پر میرا یقین اور پختہ ہو گیا ہے کہ تقلید دین کی حفاظت

اور گمراہی کو روکنے کا بہت قوی اور مؤثر ذریعہ ہے اور صدیوں سے سلف صالحین نے یہ راہ خوب سوچ سمجھ کر اختیار کی ہے۔ **فجزاهم الله خير الجزاء عنا وعن سائر المسلمين.**

ان حالات کی وجہ سے عرصہ سے مختلف احباب ایک ایسی تحریر کا تقاضا کر رہے تھے جس کا لب ولہجہ شائستہ اور نصح پر مبنی ہو، زبان سادہ و عام فہم ہو اور وہ غلط فہمیوں کا ازالہ اور سچائی سے لوگوں کو آگاہ کر سکے مگر میں اپنی طبعی افتاد کی وجہ سے اس سے گریزاں ہی رہا، یہاں تک کہ محترم جناب عبدالرحیم قریشی صاحب (سیکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ) نے بعض ایسے رسائل کے تراشے بھیجے جو غیر مقلد ذمہ دار حضرات کے زیر ادارت نکلتے ہیں اور ذمہ دار اداروں کے ترجمان ہیں، یہ تحریریں نہایت ناشائستہ ہیں اور کم سے کم جو بات ان کے بارے میں کہی جا سکتی ہیں وہ یہ کہ نہایت دنائت کا مظہر ہیں۔ **والی الله المشتكى.**

اسی پس منظر میں راقم الحروف نے یہ مختصر تحریر مرتب کی ہے، کوشش کی گئی ہے کہ مثبت انداز میں بات کہی جائے، لب ولہجہ مناظرانہ نہ ہو، اللہ جانتا ہے کہ اس کے پیچھے عصبیت جاہلیہ کار فرما نہیں ہے بلکہ یہ نصح وخیر خواہی کا ایک تحفہ اور ایک پیغام محبت ہے اور ایک دعوت ہے کہ غیر مقلد حضرات میں ایک اچھا خاصا طبقہ ان مخلصین کا بھی ہے جو اسلام کی سربلندی اور اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ رکھتے ہیں، وہ خوب سنجیدگی سے حقائق کو سمجھنے کی کوشش کریں اور ایک ایسی راہ نہ کھولیں جو امت کو انکار کی سمت لے جاتی ہو اور فروعی وجزوی مسائل کو امت میں اختلاف وافتراق کا ذریعہ نہ بنائیں۔

میں اس موقعہ پر محبی فی اللہ جناب مولانا عبدالقوی صاحب۔ (مہتمم مدرسہ اشرف العلوم حیدرآباد) کا خصوصیت سے شکر گذار ہوں کہ اس وقت یہ تحریر انہی کی توجہ

سے اشاعت پذیر ہو رہی ہے، بلکہ اس کتاب کی تالیف وترتیب میں بھی انکی تحریک اور توجہ دہانی کو خاص دخل ہے۔ **فجزاہُ اللّٰہ خیر الجزاء.**

خدا کرے کہ یہ تحریر دلوں پر دستک دے سکے اور افراط وتفریط کی اس فضا میں عدل واعتدال کا چراغ روشن کرنے میں کامیاب ہو، **وللّٰہ الحمد اولاً وآخرًا اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ.**

خالد سیف اللہ رحمانی
بیت العلم، کوتہ پیٹ، بارکس
حیدرآباد
۱۰ر ذوقعدہ ۱۴۱۸ھ

[ ]

تقلید............حقیقت اور ضرورت

عام طور پر تقلید کے بارے میں یہ غلط فہمی پیدا کی جاتی ہے کہ گویا تقلید حضرات ائمہ کرام کو رب مان لینے اور ان کو حلال وحرام کا حق دینے کے مترادف ہے، اس لئے یہ شرک ہے اور آج کل غیر مقلد علماء اس کو شرک فی الرسالہ کا عنوان دیتے ہیں۔

یہ محض غلط فہمی اور ناسمجھی کی بات ہے، تقلید کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ نعوذ باللہ ائمہ کو تحلیل وتحریم کا مختار مانا جائے اور سمجھا جائے کہ یہ حضرات بطور خود کسی کو حلال یا حرام کر سکتے ہیں، جو حضرات مقلد ہیں وہ ایسا عقیدہ ہرگز نہیں رکھتے اور اگر واقعی وہ ایسا عقیدہ رکھیں تو یقیناً یہ عقیدہ مشرکانہ ہوگا، تقلید کی حقیقت محض یہ ہے کہ فقیہ کی تقلید کی جاتی ہے اس کے بارے میں یہ حسن ظن ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول s کے منشأ کو صحیح طور پر سمجھ کر ہی اس فقیہ نے یہ رائے قائم کی ہوگی۔ وہ ائمہ مجتہدین کو شارح سمجھتا ہے نہ کہ شارع اور مقصود قرآن وحدیث ہی کی پیروی ہوتی ہے نہ کہ اس امام اور مجتہد کی۔

تقلید کی حقیقت:

اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے تقلید کی جو تعریف فقہاء نے کی ہے اس کو سامنے رکھنا کافی ہوگا۔ قاضی عبد النبی احمد نگری کا بیان ہے:

”اتباع الانسان غیرہ فی مایقول بقول اوفعل معتقد الحقیة فیه من غیر نظرٍ وتأمل فی الدلیل“ 🗁

🗁 دستور العلماء ۳۴۱/۱۔

ترجمہ: ایک شخص کا دوسرے شخص کے قول وفعل کی، دلیل میں غور وفکر کئے بغیر، اس کے حق ہونے کا گمان رکھتے ہوئے پیروی کرنا تقلید ہے۔

علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں:

التقلید العمل بقول من لیس قوله احدی الحجج بلا حجةٍ. 🗀

ترجمہ: تقلید اس شخص کے قول پر بلا حجت عمل کرنا ہے جس کا قول حجت نہیں۔

ابن ہمام نے جو تعریف کی ہے قریب قریب اسی طرح الفاظ امام غزالی، شیخ ابو منصور ماتریدی وغیرہ سے بھی منقول ہیں .... ان عبارتوں سے دو باتیں واضح ہیں۔ اول یہ کہ تقلید کا مقصد بذات خود امام کی اتباع نہیں بلکہ کتاب وسنت کی اتباع ہے، البتہ مقلد کو یہ حسن ظن ہوتا ہے کہ اس امام نے جو رائے اختیار کی ہے وہ قرآن وحدیث سے زیادہ موافق اور ہم آہنگ ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی کہ جیسے کوئی شخص بخاری مسلم کی کسی حدیث کو اس حسن ظن کی بنا پر قبول کرے کہ امام بخاری تحقیق حدیث میں صحیح نتیجہ تک پہنچے ہوں گے حالانکہ احتمال اس میں غلطی کا موجود ہے پس جیسے محدث پر روایت حدیث کے بارے میں حسن ظن سے کام لیا جاتا ہے، اسی طرح ایک مقلد امام مجتہد کے بارے میں معانی حدیث کو صحیح طور پر سمجھنے کے بارے میں حسن ظن اور نیک گمان رکھتا ہے۔

پھر اس کے ساتھ اس بات کا اضافہ کیجئے تو بات اور منقح ہو جاتی ہے کہ تقلید کے حکم میں یہ بات داخل ہے کہ اس بات کا عقیدہ رکھے کہ اس کا امام غلطی سے معصوم اور مبرا نہیں ہے اور اس بات کا بھی احتمال موجود ہے کہ شاید اس نے صحیح نتیجہ تک پہونچنے میں لغزش کی ہو اور اس کی رائے غلط ہو۔ ظاہر ہے کہ اگر ائمۂ مجتہدین کو "اربابًا من

🗀 تیسیر التحریر ٤ ی/٢٤١۔

دون اللّٰه" کا درجہ دیا گیا ہوتا اور حلال وحرام کی کلید ان کے ہاتھ میں دی گئی ہوتی تو ان کے بارے میں اجتہادی غلطی کا تصور بھی کیوں کر کیا جاسکتا تھا؟

دوسرے تقلید کی حقیقت میں یہ بات داخل ہے تقلید ایک ایسے شخص کی اتباع کا نام ہے کہ جس کی رائے بذات خود حجت نہیں، گویا مقلد اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ جیسے اللہ اور اس کے رسول کی بات حجت ہے اس طرح ائمہ مجتہدین کی رائے حجت اور دلیل نہیں۔

اس کے باوجود اگر تقلید کو شرک قرار دیا جائے اور مقلدین کے بارے میں کہا جائے کہ وہ ائمہ کرام کو "رب" کا درجہ دیتے ہیں تو یہ کتنی بڑی جسارت اور ظلم کی بات ہوگی۔ اور اس سے بڑھ کر بھی کچھ غلط بیانی ہوسکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے گمراہوں کی اتباع سے ضرور منع فرمایا ہے لیکن جو لوگ ہدایت یافتہ ہوں، ان کی اقتداء کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ربّانی ہے:۔

أُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ. (الانعام: ٩٠)

ترجمہ: یہ وہ لوگ تھے جن کو اللہ نے ہدایت سے سرفراز فرمایا، اس لئے تم بھی ان کے طریقہ پر چلو۔

............تقلید دراصل اسی حکم قرآنی کی تعمیل اور مہتدین کی اقتداء کا نام ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ غیر مقلد حضرات کی شرک فی الرسالۃ کی نئی اصطلاح بجائے خود مشرکانہ تصور کی غماز ہے، کیوں کہ شرک وتوحید کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات سے ہے نہ کہ حضرات انبیاء کرام h کی ذات سے۔ نیز حلال وحرام کرنے کا اختیار بھی براہ راست اللہ کو ہے نہ کہ رسول کو، رسول اس باب میں محض منشائے ربانی کا ترجمان ہوتا ہے نہ کہ خود کسی چیز کو حلال یا حرام کرنے کا مالک ومختار۔ اور یہ تعبیر اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ مقام رسالت بھی کسی چیز کو حلال حرام کرنے یا قانون شریعت

وضع کرنے میں مؤثر اور دخیل ہے............اس لئے شرک فی الرسالۃ کی تعبیر دراصل بجائے خود ایک مشرکانہ مفہوم کی تعبیر ہے اور غیر مقلد بھائیوں کو اپنے حلقہ کی اس نئی اصطلاح سے اجتناب کرنا چاہئے۔

اگر مقلدین ائمہ کے اقوال کو نعوذ باللہ شریعت کا درجہ دیتے تو کبھی بھی ائمہ کے اقوال کو چھوڑنا جائز نہیں ہوتا۔لیکن سیکڑوں مسائل ہیں کہ جہاں مقلدین نے صحیح اور صریح نصوص کی موجودگی یا اپنے امام کے قیاس کے مقابلہ دوسرے قوی تر قیاس کے سامنے آجانے کی وجہ سے امام ابوحنیفہ ا کے بجائے امام ابو یوسف اور امام محمد کی رائے کو قبول کیا ہے۔اور ابن نجیم ا نے حاوی قدسی سے یہ اصول ہی نقل کیا ہے کہ۔

ان الامام اذا كان في جانبٍ وهما في جانب فالاصح ان الاعتبار لقوة المدرك. (البحر: ٦/٢٦٩)

ترجمہ: امام ابوحنیفہ ا ایک رائے کے حامل ہوں اور صاحبین اس کے برخلاف تو صحیح یہ ہے کہ قوت دلیل کا اعتبار ہوگا۔

فقہاء شوافع نے دسیوں مسائل میں امام شافعی ا کے قول جدید کے بجائے قول قدیم پر فتویٰ دیا ہے، کیوں کہ ان مسائل میں آپ کے قدیم اقوال ظاہر نصوص سے زیادہ قریب تھے۔امام نووی ا نے شرح مہذب کے مقدمہ میں تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے🗀 فقہاء حنابلہ کے یہاں بھی کثرت سے یہ روش پائی جاتی ہے کہ امام احمد ا کے بعض اقوال کو قوت دلیل کی بناء پر ترک کیا جاتا ہے۔جن حضرات نے "المغنی" یا "الاقناع" وغیرہ کا مطالعہ کیا ہے وہ ضرور اس کی تصدیق کریں گے...... مالکیہ کے یہاں گو تقلید میں کسی قدر زیادہ شدت ہے

🗀 تفصیل کیلئے دیکھئے: شرح مہذب: ١/٦٦۔

لیکن ابن رشد اور ابن عربی مالکی وغیرہ نے متعدد مواقع پر امام مالک کی رائے کے مقابلہ دوسری آراء کو ترجیح دیا ہے۔

حنفیہ کے یہاں تو یہاں تک صراحت ملتی ہے کہ اگر کوئی مقلد ایسا صاحب علم اور احکام ودلائل سے آگاہ ہو کہ وہ شارع کے منشاء کو سمجھ سکتا ہو، احادیث کی تحقیق کرسکتا ہو اور محقق عالم ہو اور کسی خاص مسئلہ میں اس کو اپنے امام کا مذہب قرآن وحدیث سے زیادہ مطابق نظر نہیں آتا ہو تو اس کے لئے نص پر عمل کرنا اور امام کی رائے کو چھوڑ دینا درست ہے۔چنانچہ علامہ شامی لکھتے ہیں:

في خزانة الروايات العالم الذي يعرف معنى النصوص والاخبار وهو من اهل الدراية يجوزله ان يعمل عليها وان كان مخالفًا لمذهبه.🗀

ترجمہ: خزانۃ الروایات میں ہے کہ عالم جو نصوص واحادیث کے مفہوم ومنشاء سے واقف ہو اور اصحاب درایت میں سے ہو، اس کیلئے نصوص پر عمل کرنا درست ہے گو اس کے مکتب فقہی کے خلاف ہوں۔

اس سلسلہ میں علامہ ابن ہمام کی یہ وضاحت بھی بڑی چشم کشا ہے:

اذا رأى القول المخالف لمذهب امامه دليلاً قويا راجحا اذا المكلف مامور باتباع نبيه صلى الله عليه وسلم وهذا هو الموافق لما روى عن الامام احمد والقدورى وعليه مشى طائفة من العلماء منهم ابن الصلاح وابن همدان. 🗎

🗀 شامی: ۵١/١۔

🗎 تیسیر التحریر ٢٥٥/٤۔

ترجمہ: اپنے امام کے مذہب کے خلاف قول کو دلائل کے اعتبار سے قوی اور راجح محسوس کرے تو اس کی طرف عدول کرسکتا ہے، کیوں کہ مکلّف رسول اللہ s کی اتباع پر مامور ہے، یہ رائے اس کے مطابق ہے جو امام احمد اور امام قدروی سے منقول ہے اور اسی پر علماء کا ایک گروہ چلا ہے جن میں ابن اصلاح اور ابن ہمدان بھی ہیں۔

ماضی قریب کے علماء میں مولانا اشرف علی تھانوی ا بڑے محقق اور صاحب بصیرت عالم گذرے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

”البتہ اگر قول ابی حنفیہ کو کسی آیت یا حدیث کے خلاف دیکھیں گے تو اس وقت بیشک اس کو ترک کریں گے..........اگر امام کی دلیل سوائے قیاس کے اور کچھ نہ ہو اور حدیث معارض ہو تو قول امام کو چھوڑ دیا جاتا ہے، جیسے **ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام** میں ہوا ہے کہ امام صاحب نے قدر غیر مسکر کو جائز کہا ہے اور حدیث میں اس کے خلاف کی تصریح موجود ہے، یہاں امام صاحب کے قول کو چھوڑ دیتے ہیں مگر اس کے لئے بڑے تبحّر کی ضرورت ہے“۔

ایک اور موقع پر تقلید شخصی کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

”اس حکم کو مقصود بالذات سمجھنا بے شک بدعت ہے لیکن مقصود بالغیر سمجھنا یعنی مقصود بالذات کا مقدمہ سمجھنا یہ بدعت نہیں بلکہ طاعت ہے“۔

ان سطور سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہے کہ تقلید نعوذ باللہ ائمہ فقہ کے اقوال و آراء کو شریعت کا درجہ دینا ہرگز نہیں، اگر ایسا ہوتا تو بڑے بڑے محدثین وفقہاء نے کیسے تقلید کی راہ اختیار کی ہوتی، پھر یہ عجیب اتفاق ہے کہ تفسیر قرآن اور احادیث شریفہ کی تدوین وتشریح کا جو کچھ کام ہوا ہے چند کتابوں کو چھوڑ کر یہ سب مقلدین ہی کا

اجتہاد وتقلید کا آخری فیصلہ بحوالہ: القول الجلیل ۷۰۔ حسن العزیز ۴؍۷؍۳۹۷۔

بوادر النوادر، رسالہ اعداد الجنۃ: ۷۷۹۔

کارنامہ ہے، اگر کتاب وسنت کی ان حضرات کی نگاہ میں اہمیت نہ ہوتی تو ان حضرات نے ان علوم وفنون کو کیسے یہ اہمیت دی ہوتی؟ پھر فقہ کی کتابوں میں آپ قدم قدم پر ملاحظہ کرتے ہیں کہ ہر مسئلہ سے متعلق قرآن وحدیث سے دلائل پیش کئے جاتے ہیں تو ان دلائل کے ذکر کئے جانے کی کیا حاجت ہوتی؟ اور پھر یہ حضرات ان دلائل میں ترجیح اور رد وقدح سے کیوں کام لیتے؟ ظاہر ہے یہ سب کچھ اسی لئے ہے کہ ان حضرات نے قرآن وحدیث ہی کو قانون کا اصل سرچشمہ سمجھا ہے اور حضرات فقہاء کے قول کو اس کی تشریح کی حیثیت سے قبول کیا ہے اور وہ بھی یہ مانتے ہوئے کہ اس میں غلطی کا امکان موجود ہے..........اس کے باوجود تقلید کو اللہ اور اس کے رسول s کی اطاعت واتباع کے بجائے شرک وہی شخص کہہ سکتا ہے جو یا تو ناسمجھ اور ناواقف ہو، یا ناسمجھ لوگوں کو دھوکہ میں رکھنا چاہتا ہو۔

تقلید کیوں ضروری ہے؟

جو لوگ اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتے ہوں، ان پر مطلق تقلید کے واجب ہونے میں تو کوئی کلام ہی نہیں ہوسکتا، گو اس پر آیات قرآنی اور احادیث کی بھی دلیلیں موجود ہیں لیکن یہ تو ایک معمولی عقل وفہم رکھنے والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ ناواقف کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ جو لوگ واقف وآگاہ ہیں، ان پر اعتماد واعتبار کرے۔

غور کیا جائے تو فقہی احکام اپنے دلائل کے اعتبار سے چار قسم کے ہیں:۔

1 ...... جو ذریعۂ ثبوت کے اعتبار سے بھی یقینی ہوں اور اس کے الفاظ غیر مبہم طور پر اپنی مراد پر دلالت کرتے ہیں، مثلاً ”**حرمت علیکم امھاتکم**“ یہ آیت قرآنی ہے جو نہایت یقینی اور غیر مشکوک ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہے اور اپنے مفہوم میں بے غبار ہے کہ ماں سے نکاح کرنا جائز نہیں، ایسے احکام کو ”قطعی الثبوت“ اور ”قطعی الدلالۃ“ کہا جاتا ہے۔

2 ......جن کا ذریعہ ثبوت یقینی ہو، لیکن وہ اپنا مفہوم بتلانے میں پوری طرح واضح نہ ہوں مثلاً قرآن مجید نے عدت کو "ثلاثة قروء" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے "قرء" کے معنی عربی زبان میں حیض کے بھی ہیں اور طہر کے بھی، اس طرح یہ قطعی الثبوت تو ہے لیکن "ظنی الدلالۃ" ہے۔

3......جن کا ذریعہ ثبوت یقینی اور غیر مشکوک نہ ہو، لیکن اس کا مفہوم بالکل واضح اور دوٹوک ہو، مثلاً حدیث میں ہے کہ بغیر پاکی کے قرآن نہ چھوا جائے "لا یمسه الا طاهر" چوں کہ یہ خبر واحد ہے جو قطعی نہیں ہوتی، اس لئے ظنی الثبوت ہے لیکن اپنے مفہوم میں واضح ہونے کی وجہ سے قطعی الدلالۃ ہے۔

4 ......جن کا ذریعۂ ثبوت بھی غیر یقینی ہو اور وہ اپنے مقصود اور مفہوم کے اظہار میں بھی مبہم ہو، جیسے "تحریمها التکبیر" کہ نماز کا تحریمہ تکبیر ہے، خبر واحد ہونے کی وجہ سے اس کا ذریعۂ ثبوت یقینی نہیں دوسری طرف "تکبیر" سے "اللہ اکبر" بھی مراد ہوسکتا ہے اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ مطلقاً اللہ کی کبریائی بیان کرنا مقصود ہے، چاہے اس کے لئے اللہ اکبر کہا جائے یا کوئی جملہ، ایسے احکام ظنی الثبوت اور ظنی الدلالۃ ہیں۔

5 ...... پانچویں صورت یہ ہے کہ دو ایسی دلیلیں جن کا ذریعۂ ثبوت یقینی یا غیر یقینی ہو اور مفہوم بھی واضح و بے غبار ہو لیکن بظاہر وہ ایک دوسرے سے متعارض ہوں، مثلاً قرآن مجید کا ارشاد ہے "انکحوا لایامٰی منکم". اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں خود اپنا نکاح کرنے کی مجاز نہیں ہیں، تب ہی ان کے اولیاء کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ بے شوہر عورتوں کا عقد کردیں۔ دوسری طرف فرمایا گیا "ولا تعضلوهن ان ینکحن ازواجهن". یہاں نکاح کرنے کی نسبت خود عورتوں کی طرف کی گئی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود اپنا نکاح کرسکتی ہیں۔

ایسی صورتوں میں بھی ظاہری تعارض کی وجہ سے احکام ظنی ہوجاتے ہیں اور قطعی

باقی نہیں رہتے۔

غور کیا جائے تو ان میں سے پہلی صورت ایسی ہے کہ اس میں نہ فقہاء کے درمیان اختلاف ہے نہ اجتہاد کی ضرورت ہے اور نہ تقلید درکار ہے، اس کے بعد بقیہ چار صورتوں میں .... کہ اکثر عملی اور فروعی احکام اسی نوع کے ہیں .... اجتہاد و استنباط ضروری ہے، جس میں مجتہد کو خاص طور پر تین کام کرنے ہوتے ہیں، اول یہ کہ جن ذرائع سے یہ احکام ہم تک پہونچے ہیں وہ یقینی ہیں یا اس میں غلطی کا امکان بھی ہے۔ کتب حدیث کا ذخیرہ اور اسماء رجال کا پورا فن اسی مقصد کے لئے وجود میں آیا ہے۔ دوسرے ان دلائل کے ذریعہ ہم نے جو مفہوم سمجھا ہے، عربی زبان و قواعد اور اصول استنباط کی رو سے یہ کس حد تک صحیح ہے؟ عربی لغت، نحو و صرف، معانی و بیان کے قواعد تو اس کے لئے ضروری ہیں ہی، یہ بھی ضروری ہے کہ اصول فقہ پر اس کی وسیع اور گہری نظر بھی ہو۔ تیسرے وہ دو متعارض دلائل میں تاریخی اعتبار سے تقدم اور تأخر کی تحقیق کرے اور یہ نہ ہوسکے تو ایسی تطبیق اور توفیق پیدا کرے اور دونوں کے لئے ایسے محل متعین کرے کہ تعارض ختم ہوجائے ورنہ پھر حدیث و فقہ کے اصول کو سامنے رکھ کر ایک کو ترجیح دے اور دوسرے کو ترک کردے، ان تین امور کے علاوہ چوتھی چیز جو اس کے لئے نہایت ضروری ہے وہ یہ کہ شریعت کے مجموعی مزاج و مذاق اور اس کی روح سے آشنا ہو، اس کے لئے فقہی کلیات پر نظر ناگریز ہے جو "قواعد فقہ" اور "اشباہ و نظائر" کے نام سے مستقل فن کی صورت میں معرض وجود میں آچکا ہے۔

اب ایک صورت تو یہ ہے کہ کچھ لوگ اس نوع کے مسائل میں اجتہاد کا فریضہ انجام دیں اور اپنی قوت استدلال سے کام لے کر ان کا حل تلاش کریں اور دوسرے لوگ جو علم و فہم کے اعتبار سے اپنے آپ کو اس سے قاصر پاتے ہوں اس حسن ظن کے ساتھ ان کی تحقیق پر تکیہ کریں کہ انہوں نے صحیح طور پر احکام کو سمجھا ہوگا، دوسری صورت

یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کا مکلّف کیا جائے کہ وہ خود اس کا راجتہاد کو انجام دے............
ہر صاحب انصاف کہے گا کہ یہ دوسری صورت انسان پر ایک ایسی مشقت کا بار رکھنا ہے جو اس کے لئے ناقابل برداشت بھی ہے اور اس سے زیغ وضلال کا ایسا دروازہ کھلے گا کہ جس کا سد باب کسی طور پر ممکن نہ ہوگا، جب کہ پہلی صورت میں عام انسانوں کے لئے عافیت بھی ہے اور گمراہی کا امکان کم یا بالکل نہیں ہے، اس پہلی صورت کا نام جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ''تقلید'' ہے۔...

اسی لئے علماء نے ان لوگوں کے لئے جو اجتہاد کی اہلیت نہ رکھتے ہوں ''تقلید'' کو واجب قرار دیا ہے۔ آمدی کہتے ہیں:

العامی ومن لیس له اهلیة الاجتهاد وان کان محصلا لبعض العلوم المعتبرة فی الاجتهاد یلزمه اتباع قول المجتهدین والأخذ بفتواه عند المحققین من الاصولین. 🗁

ترجمہ: عوام اور وہ لوگ جن میں اجتہاد کی اہلیت نہیں، اگر چہ وہ اجتہاد میں معتبر بعض علوم کی واقفیت بھی رکھتے ہوں ان پر مجتہدین کے قول کی اتباع اور ان کے فتویٰ کو اختیار کرنا اصول فقہ کے محقق علماء کے نزدیک لازم ہے۔

علامہ ابن ہمام کا بیان ہے:

غیر المجتهد المطلق یلزمه عند الجمهور التقلید. 🗎

ترجمہ: جمہور کے نزدیک غیر مجتہد مطلق کے لئے تقلید لازم ہے۔

🗁 الاحکام للآمدی: ٤/٢٢٤ـ

🗎 تیسیر التحریر: ٤/٦٤٦ـ

غیر مقلد خود مقلدّ ہیں:

اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں میں اجتہاد واستنباط کی صلاحیت نہ ہو، ان کے لئے تقلید کو سوا چارہ نہیں، خود غیر مقلد حضرات کا اپنے آپ کو تقلید سے بری کہنا ایک لطیفہ سے کم نہیں، غور کرو کہ جن مشہور مسائل واحکام میں غیر مقلد حضرات نے احناف یا جمہور امت سے الگ راہ بنائی ہے، ان میں اکثر وہ ہیں کہ عہد صحابہ p عہد تابعین اور ہر دور کے اہل علم میں ان کی بابت اختلاف رائے رہا ہے، اگر یہ حضرات مقلد نہ ہوتے بلکہ خود اجتہاد سے کام لیتے تو ضرور تھا کہ یہ حضرات بھی ان مسائل کی بابت متفق نہ ہوتے اور ان کی رائیں بھی باہم مختلف ہوتیں، لیکن ہندوستان میں مشہور مسائل میں تمام غیر مقلدین ایک ہی نقطۂ نظر کے حامل ہیں ....اسی لئے معروف غیر مقلد عالم نواب وحید الزماں لکھنوی ثم حیدر آبادی نے لکھا ہے اور صحیح لکھا ہے کہ:

''اہل حدیث گو امام ابوحنیفہ ا اور امام شافعی ا کی تقلید کو حرام کہتے ہیں لیکن ابن تیمیہ ا، ابن قیم ا، شوکانی ا اور نواب صدیق حسن خان کی اندھا دھند تقلید کرتے ہیں''۔

(التوحید والسنة: ۲۹۳)

تقلید شخصی......نفس پرستی کو روکنے کا ذریعہ:

حقیقت یہ ہے کہ مطلق تقلید کی ضرورت سے کوئی بھی صاحب عقل انکار نہیں کر سکتا، اگر کچھ اشکال ہو سکتا ہے تو شخصی تقلید پر کہ تمام مسائل واحکام میں کسی ایک ہی امام ومجتہد کی تقلید کیوں کی جائے .... اس سلسلہ میں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ شریعت میں کچھ واجبات وہ ہیں جو بجائے خود مقصود ہیں، جیسے نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ وغیرہ۔ ور کچھ باتیں وہ ہیں جو اس لئے واجب ہیں کہ ان واجبات کو ادا کرنے

کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں، جیسے نماز کی ادائیگی کے لئے گھر سے مسجد تک جانا، زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے اپنے مال کا حساب کرنا، اگر کوئی شخص سحری کھائے بغیر روزہ رکھنے پر قادر نہ ہو تو اس کے لئے سحری کھانا، موجودہ زمانہ میں سفر حج کے لئے پاسپورٹ بنانا، غور فرمایئے کہ گھر سے مسجد تک چلنا، اپنے اثاثہ وسرمایہ کا حساب کتاب کرنا، سحری کھانا اور پاسپورٹ بنوانا اپنی اصل کے اعتبار سے واجب نہیں بلکہ بعض تو سنت ومستحب بھی نہیں ہیں لیکن چوں کہ یہ شریعت کے فرائض واجبات کے لئے ذریعہ ووسیلہ کا درجہ رکھتے ہیں اس لئے یہ بھی واجب کہلائیں گے۔

اسی طرح بعض باتیں وہ ہیں کہ بذات خود حرام ہیں جیسے شراب، زنا، چوری وغیرہ اور بعض امور وہ ہیں کہ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے حرام نہیں لیکن حرام کا ذریعہ بن سکتے ہیں تو ایسے ذرائع سے بھی بچنا واجب ہے، مثلاً ایک عام آدمی کو بلا ضرورت شرعی شراب خانہ میں جانے سے بھی منع کیا جائے گا کیوں کہ گناہ گار کی صحبت آدمی پر ضرور ہی اپنا اثر ڈالتی ہے، اسی طرح اس بات سے منع کیا جائے گا کہ وہ ایسی محفلوں میں جائے جہاں برہنگی پائے جانے کا غالب گمان ہو جیسا کہ آج کل مغربی ممالک کی کلبوں کے بارے میں سنا جاتا ہے، اس لئے کہ یہ برائی تک پہنچانے کے ذرائع ہیں۔

ذرائع کو مقصود کے حکم میں رکھنا خود رسول اللہ s کے ارشادات وفرمودات سے ثابت ہے، غور فرمایئے کہ اصل گناہ تو شراب پینا ہے لیکن آپ s نے اسی حکم میں شراب کے لئے پھلوں کا رس نچوڑنے والے، نچوڑوانے والے خریدنے اور بیچنے والے اور پلانے والے کو رکھا اور سبھوں پر اللہ کی لعنت بھیجی۔ کیوں کہ یہ سب بالواسطہ طریقہ پر شراب نوشی کی حوصلہ افزائی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اسی طرح اصل حرمت تو سود لینے کی ہے، لیکن آپ s نے سود دینے والے، سودی کاروبار لکھنے والے اور سودی معاملات پر گواہ بننے والے کو بھی گنہگار قرار دیا، کیوں یہی سودی معاملات کے پنپنے اور فروغ پانے کا باعث ہیں۔

تقلید شخصی کا واجب ہونا بھی دراصل اسی قاعدہ کے تحت ہے، اللہ اور اللہ کے رسول s نے خواہش نفس کی پیروی کو منع فرمایا ہے اور کتنے ہی مواقع پر اس کی مذمت فرمائی۔ اتباع نفس کی حرمت اور گناہ ہونے میں ظاہر ہے کسی مسلمان کو اختلاف نہیں ہوسکتا۔ اب غور کیا جائے کہ موجودہ زمانہ میں اگر لوگوں کو کسی ایک فقیہ کی رائے کا پابند نہ کیا جائے اور ان کو اجازت دی جائے کہ وہ اپنے طور پر جس عالم کی رائے کو بہتر سمجھے قبول کرلیں تو ایسی صورت میں اس بات کا اندیشہ ہے یا نہیں، کہ لوگ مختلف فقہاء کے یہاں سے آسانیوں اور سہولتوں کا تلاش کرنے لگیں اور دین کو کھلونا بنا کر رکھ دیں؟ مثلاً نماز ہی کے مسئلہ کو دیکھ لیجئے کہ اس کا درست ہونا پاک ہونے پر موقوف ہے، حنفیہ کے یہاں قہقہہ سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، دوسرے فقہاء کے یہاں نہیں ٹوٹتا، امام شافعی کے نزدیک عورت کو ہاتھ لگانا یا خود اپنی شرمگاہ کو چھونا وضو کو توڑ دینے والا فعل ہے حنیفہ اور بعض صورتوں میں مالکیہ کے یہاں وضو نہیں ٹوٹتا، مالکیہ کے یہاں جسم کے کسی حصہ سے خون نکل جائے تو وضو نہیں ٹوٹتا، اکثر فقہاء کے نزدیک ٹوٹ جاتا ہے، حنابلہ کی نزدیک اونٹ کا گوشت کھانا بھی ناقض وضو ہے، دوسرے فقہاء کے یہاں اس سے وضو نہیں ٹوٹتا، ظاہریہ کے نزدیک اگر ہمبستری میں انزال نہ ہو تو غسل کی ضرورت نہیں، دوسرے فقہاء کے نزدیک انزال نہ ہو تب بھی ہمبستری سے غسل واجب ہوجائے گا۔ اب ہوگا یہ کہ ایک شخص نے قہقہہ لگایا تو اس میں شوافع حنابلہ وغیرہ کی رائے لے گا، عورت کو چھوا تو وہاں حنفیہ کی رائے کو قبول کرلے گا، شرمگاہ کو ہاتھ لگانے کے مسئلہ میں مالکیہ کی رائے پر عمل کرے گا، خون نکل گیا تو امام شافعی ا کی رائے اختیار کرلے گا، بلا انزال ہمبستری کا موقعہ آ گیا تو اصحاب ظواہر سے اتفاق کرے گا، اس طرح بحیثیت مجموعی تو کسی کی رائے پر بھی اس کی نماز درست نہیں ہوگی۔ اور اس طرح خواہشات کی اتباع نماز کو ایک کھلونا بنا کر رکھ دے گی۔

نماز تو ایک معمولی مثال ہے، اس سے بھی زیادہ خراب صورت اس وقت پیش

آئے گی جب حلال وحرام کے مسائل میں کوئی شخص مختلف اہل علم کی آراء سے سہولتوں اور آسانیوں کا متلاشی ہو، مثلاً بعض محدثین ...... کے نزدیک چند کو مستثنیٰ کر کے تمام دریائی سانپ اور دریائی خنزیر بھی حلال ہیں، اصحاب ظواہر کا خیال تھا کہ سونا چاندی، گیہوں، جو، نمک اور کھجور ان چھ چیزوں کے سوا تمام اشیاء میں سود حلال ہے، عام طور پر غیر مقلدین کا طرز استدلال وہی ہے جو اصحاب ظواہر کا ہوتا تھا

....، بہ ظاہر یہ صورت سود کے دروازہ کو کھول دیتی ہے۔ اسی طرح بعض علماء سلف کا خیال ہے کہ قرآن میں جس ''خمر'' (شراب) کا ذکر کیا گیا ہے اس سے محض انگوری شراب مراد ہے جس کی قلیل وکثیر مقدار یکساں طور پر حرام ہے، باقی دوسری چیزوں سے بنائی جانے والی شراب اس وقت حرام ہے جب اتنی مقدار میں ہو کہ اس سے نشہ آجائے، .... بعض اکابر سلف کی طرف نکاحِ متعہ کا جواز منسوب ہے بلکہ ایک محدث کی طرف بیوی کے ساتھ غیر فطری عمل کی اجازت بھی منسوب کی گئی ہے، ویسے ظاہر ہے کہ یہ نسبت قطعاً غلط اور خلاف واقعہ ہے، تقلید کے ایک سخت ناقد کے نزدیک جس عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہو اور اس کو نکاح کا پیغام دیا گیا ہو اس کو بے لباس حالت میں بھی دیکھنے کی اجازت ہے، **وغیرہ ذٰلک**۔

حالاں کہ ان مسائل کا تذکرہ بھی بار خاطر ہے اور ان کے ذکر سے بھی حجاب آتا ہے لیکن ان کا ذکر محض اس لئے کیا گیا کہ آپ اس سے اندازہ لگائیں کہ اہل علم ونظر کے یہاں کیسے کیسے تفردات موجود ہیں جو ان کی طرف منسوب ہیں، اگر شخصی تقلید کو واجب قرار نہ دیا جائے اور ہر شخص اپنی رائے کے مطابق احکام ومسائل میں اخذ وانتخاب کا مالک ہو اور نفس پرستی اور اتباع ہویٰ نے اس کے دل میں جگہ بنالی ہو تو وہ دین کے نام پر کیا کچھ بد دینیوں کے راستے اپنے لئے نکال لے گا اور اس سے گمراہی کا کیسا چوپٹ دروازہ کھل جائے گا کہ پھر اس کو بند کرنا آسان نہ ہوگا اسی راستہ کو بند

First Proof	15-06-09
Second Proof	05-08-09
FINAL	00-00-00
TOTAL-PAGE	

کرنے کے لئے خوب سوچ سمجھ کر چوتھی صدی ہجری کے بعد سلف صالحین نے تقلید شخصی کو واجب قرار دے دیا اور آج تک ہر دور کے فقہاء ومحدثین اور علماء صالحین اور اپنے عہد کے محققین نے یہی تقلید شخصی کی راہ اختیار کی ہے اور اس فتنہ وہوا پرستی کے عہد میں تقلید کو ایک ضرورت تسلیم کیا ہے۔

ترک تقلید کا نقصان:

ممکن ہے غیر مقلد بھائیوں کو یہ بات گراں گذرے کہ تقلید سے آزادی انسان کو نفس پرستی اور بالاخر دین سے آزادی کی طرف لے جاتی ہے...... لیکن یہ ایک حقیقت واقعہ ہے کہ ہندوستان میں غیر مقلد تحریک کو اُٹھے ہوئے بہت دن نہیں ہوئے، شاہ نذیر حسین محدث دہلوی ا سے ہندوستان میں اس فرقہ کی بنیاد پڑی لیکن یہی مختصر عرصہ اس کا اندازہ کرنے کے لئے کافی وشافی ہے۔ اس سلسلہ میں چند مثالیں پیش کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ خود جماعت غیر مقلدین کے کچھ معتبر علماء کی تحریریں پیش کردی جائیں جن کو اپنی جماعت کی بے سمتی کا اندازہ ہو چکا تھا اور وہ اس سلسلہ میں متفکر تھے۔

نواب صدیق حسن خان ا اس گروہ کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اس زمانہ میں ایک شہرت پسند اور ریا کار فرقہ پیدا ہوا ہے جو باوجود ہر قسم کی خامیوں کے قرآن وحدیث کے علم اور ان پر عمل کا مدعی ہے حالانکہ اس فرقہ کو علم وعمل اور (صحیح دینی) معرفت کے ساتھ، کسی طرح کا کوئی تعلق نہیں ہے'' 🗀

''تعجب کی بات ہے کہ غیر مقلدین کیوں کر اپنا نام خالص موحد رکھتے اور دوسروں کو (جو تقلید کرتے ہیں) مشرک کہتے ہیں، حالانکہ یہ خود سب لوگوں سے بڑھ کر سخت متعصب اور غالی ہیں''۔ 🗎

🗀 الحطة فی ذکر صحاح الستة، ص: ۱۳، ط: بیروت۔

🗎 حوالۂ سابق، ص: ۱۴۰۔

اور ایک بڑے غیر مقلد عالم مولانا محمد حسین بٹالوی ا (متوفی ۱۳۳۸ھ ھجری) فرماتے ہیں:۔

"پچیس برس کے تجربے سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ جولوگ بے علمی کے ساتھ مجتہد مطلق اور مطلق تقلید کے تارک بن جاتے ہیں وہ آخر اسلام کو سلام کر بیٹھتے ہیں، کفر وارتداد، فسق وفجور کے اسباب دنیا میں اور بھی بکثرت موجود ہیں مگر دینداری کے بے دین ہو جانے کے لئے بے علمی کے ساتھ ترک تقلید بڑا بھاری سبب ہے، گروہ اہل حدیث میں جو بے علم یا کم علم، ہو کر ترک مطلق تقلید کے مدعی ہیں، وہ ان نتائج سے ڈریں، اس گروہ کے عوام آزاد اور خود مختار ہو جاتے ہیں"۔

سلف صالحین اور ائمہ مجتہدین کی شان میں گستاخی اور بدکلامی بھی اس طبقہ میں عام ہے اور ان کے طرز عمل کو دیکھ کر مولانا اشرف علی تھانوی ا کی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ "سلف کے ساتھ بدگمانی اور پھر بدزبانی عام طور پر غیر مقلدیت کے لوازم میں سے ہے" .... چنانچہ ایک معروف غیر مقلد عالم مولانا داؤد غزنوی ا سے نقل کیا گیا ہے کہ ایک دن بڑے دردناک لہجہ میں فرمایا:

"جماعت اہلحدیث کو حضرت امام ابو حنیفہ ا کی روحانی بد دعا لے کر بیٹھ گئی ہے، ہر شخص "ابوحنیفہ" "ابوحنیفہ" کہہ رہا ہے، کوئی بہت ہی عزت کرتا ہے تو امام ابوحنیفہ کہہ دیتا ہے، پھر ان کے بارے میں ان کی تحقیق یہ ہے کہ وہ تین حدیثیں جانتے تھے یا زیادہ سے زیادہ گیارہ، اگر کوئی بڑا احسان کرے تو وہ ستر حدیثوں کا عالم گردانتا ہے، جو لوگ اتنے جلیل القدر امام کے بارے میں یہ نقطۂ نظر رکھتے ہوں، ان میں اتحاد و یکجہتی کیوں کر پیدا ہو سکتی ہے؟ **یاغربة العلم انما اشکو بثی وحزنی الی اللّٰہ.**

رسالہ اشاعۃ السّنۃ ج: ۱۱، ط: ۱۸۸۸ء۔

مولانا داؤد غزنوی ۱۳۶۔

ایک اور موقع پر فرمایا:۔

"دوسرے لوگوں کی یہ شکایت کہ اہل حدیث حضرات ائمہ اربعہ کی توہین کرتے ہیں، بلا وجہ نہیں ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ ہمارے حلقہ میں عوام اس گمراہی میں مبتلا ہو رہے ہیں اور ائمہ اربعہ کے اقوال کا تذکرہ حقارت کے ساتھ بھی کر جاتے ہیں، یہ رجحان سخت گمراہ کن اور خطرناک ہے اور ہمیں سختی کے ساتھ اس کو روکنے کی کوشش کرنی چاہئے"۔

صحاح ستہ کے مترجم نواب وحید الزماں حیدرآبادی رقم طراز ہیں:

"غیر مقلدوں کا گروہ جو اپنے تئیں اہل حدیث کہتے ہیں، انہوں نے ایسی آزادی اختیار کی ہے کہ مسائل اجماعی کی بھی پرواہ نہیں کرتے نہ سلف صالحین، صحابہ اور تابعین کی، قرآن کی تفسیر میں لغت سے اپنی من مانی کر لیتے ہیں، حدیث شریف میں جو تفسیر آچکی ہے اس کو بھی نہیں سنتے، بعضے عوام اہل حدیث کا یہ حال ہے کہ انہوں نے صرف رفع یدین اور آمین بالجہر کو اہل حدیث ہونے کے لئے کافی سمجھا ہے، باقی اور آداب سنن اور اخلاق نبوی s سے کچھ مطلب نہیں، غیبت، جھوٹ، افتراء سے پاک نہیں کرتے، ائمہ مجتہدین رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اولیاء اللہ اور حضرات صوفیہ کے حق میں بے ادبی اور گستاخی کے کلمات زبان پر لاتے ہیں، اپنے سوا تمام مسلمانوں کو مشرک اور کافر سمجھتے ہیں، بات بات میں ہر ایک کو مشرک اور قبر پرست کہہ دیتے ہیں"۔

دوسرے بزرگوں اور خود جماعت غیر مقلدین کے نسبتاً معتدل علماء کے ذہن میں جو خدشہ تھا کہ تقلید سے آزادی کہیں رفتہ رفتہ دین ہی سے آزادی کا باعث نہ بن جائے، وہ ایک حقیقت ہے اور اسی لئے ہندوستان میں گذشتہ ایک صدی میں جتنے

حوالہ سابق ۸۷۔

حدیث اور اہلحدیث، ص: ۱۰۳۔ بحوالہ: وحیدالزماں: نواب لغات الحدیث۔

لوگوں نے اسلام کے خلاف فتنہ سامانی کی ہے وہ عام طور پر پہلے غیر مقلد ہوئے پھر بد دین، اور غیر مقلدیت نے ان کے حق میں بد دینی کے لئے ایک پُل کا کام کیا۔

چند مثالیں یہاں ذکر کی جاتی ہیں:

; مرزا غلام احمد قادیانی جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، پہلے غیر مقلد ہی بنا، وہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھتا تھا، سینہ پر ہاتھ باندھتا تھا، آٹھ رکعت کا قائل تھا، جرابوں پر مسح کیا کرتا تھا، سلام پھیرنے کے بعد دعا کو بدعت قرار دیتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ سفر کے لئے کوئی مسافت مطلوب نہیں، عرف میں جس کو سفر کہتے ہیں خواہ دو تین کوس ہی ہو، مسافر شرعی ہونے کے لئے کافی ہے۔

; مرزا غلام احمد قادیانی کے خلیفۂ اول حکیم نور الدین تھے، وہ بھی غیر مقلد ہوئے، پھر اس کے بعد قادیانی ہوگئے، یہاں تک کہ مرزا صاحب کے خلیفۂ اول ٹھہرے۔

; پاکستان میں قادیانیت کے بہت بڑے مبلغ اور پاکستانی وزیر خارجہ بھی غیر مقلد فرقہ سے ہی تعلق رکھتے تھے، بعد میں قادیانی ہوگئے۔

; ہندوستان میں جن لوگوں نے انکار حدیث پر کمر باندھی اور احادیث کی اہانت اور تمسخر کو اپنی تحریروں اور کتابوں کا موضوع بنایا وہ بھی اکثر وہی لوگ تھے جنہوں نے غیر مقلدیت کو اختیار کیا تھا، غالباً ہندوستان میں سب سے پہلے سرسید احمد خان نے انکار حدیث کی تخم بوئی معجزات اور دین کے بہت سے مسلمات کا انکار کیا، سرسید احمد خان کے بارے میں یہ بات محتاجِ اظہار نہیں کہ انہوں نے پہلے حنفیت چھوڑ کر غیر مقلدیت اختیار کی تھی اور اس پل کو پار کر کے دین کے مسلمات کے ساتھ تمسخر اور احادیث کے ساتھ انکار کے راستہ تک پہنچے اور اسی بنیاد پر علماء سے ان کا اختلاف ہوا۔

دیکھئے: سیرت المھدی ۱۳/۲، ذکر حبیب/ ۲٤، ملفوظاتِ احمدیہ ۱۹۹/۱، مجدد اعظم ۱۳۳۳/۲۔

تاریخ احمدیہ ۷۹/٤۔

تحدیثِ نعمت /۳۔

; منکرین حدیث میں ایک اہم نامی مولوی عبد اللہ چکڑالوی کا ہے انہوں نے ہندوستان میں منکرین حدیث کو ایک جماعت کی صورت دی اور ان کو اہل قرآن سے موسوم کیا، یہ صاحب بھی پہلے غیر مقلد ہوئے پھر منکر حدیث۔

; ڈاکٹر احمد دین جو الحاد وارتداد تک پہنچے اور مطلق حدیث کے منکر ہوگئے، وہ بھی پہلے غیر مقلد ہی ہوئے تھے، چنانچہ خود ڈاکٹر احمد دین کا بیان ہے:

''ہم لوگ بھی وحدت الٰہی حاصل کرتے ہوئے اہل حدیث بنے تھے، پھر معلوم ہوا کہ یہاں بجائے وحدت الٰہی کے شرک ہے جو نہایت سمجھ سوچ کر بڑے غور سے کیا جاتا ہے''۔

یہی صاحب آگے لکھتے ہیں کہ کتب صحاح ستہ قطعی طور پر قرآن مجید کے خلاف ہے۔

; نیاز فتح پوری ہندوستان میں الحاد و دہریت کے سب سے بڑے نقیب تھے اور اسلام کے مسلمہ عقائد، جنت و دوزخ، حور و قصور، جن و ملک کا نہایت تمسخر کے ساتھ ذکر کیا کرتے تھے، وہ بھی ترک تقلید ہی کے راستے پر چلے اور الحاد و دہریت تک پہنچ کر ہی رکے۔

; ان حضرات کے علاوہ علامہ عنایت اللہ مشرقی، علامہ تمنا عمادی، چودھری غلام احمد پرویز اور مولوی اسلم جیراج پوری وغیرہ جن کا حدیث اور دین کے بعض مسلمہ عقائد سے انکار محتاج بیان نہیں، یہ سبھی تقلید سے پہلے آزاد ہوئے پھر اس نوبت تک پہنچے۔

; اسی طرح اگر ہندوستان میں قرآن مجید کی تفسیر بالرأی کا جائزہ لیں تو اس میں بھی یہی طبقہ غیر مقلدین پیش پیش نظر آئے گا، اردو زبان میں جو تفسیریں لکھی گئی ہیں، ان میں سرسید احمد خاں کی تفسیر القرآن سے بڑھ کر تفسیر بالرأی کا شاید ہی کوئی نمونہ ملے اور گذر چکا ہے کہ یہ صاحب حنفی سے غیر مقلد ہوگئے تھے۔

; مولانا ثناء اللہ امرتسری | جو اساطین علماء غیر مقلدین میں ہیں،

موجِ کوثر ٥٢۔

پیغام توحید ١٦۔

انہوں نے تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن کے نام سے ایک تفسیر لکھی ہے، جس میں اپنے خیال کے مطابق قرآن ہی سے قرآن کی تفسیر کرنے کی کوشش کی ہے یہ تفسیر تفسیر بالرأی کا اعلیٰ نمونہ ہے، اسی تفسیر پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک معروف غیر مقلد عالم مولانا عبدالاحد خان پوری نے مولانا موصوف کے بارے میں لکھا ہے کہ ''ثناء اللہ ملحد، زندیق، جعد اور جہم سے ہزار درجہ بدتر ہے، بلکہ تمام کفار روئے زمین سے بدتر ہے''[1] ایک اور غیر مقلد عالم مولانا عبدالحق غزنوی نے اس تفسیر پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس شخص نے تحریفات میں یہودیوں کی بھی ناک کاٹ دی۔ [2]

دراصل ترک تقلید سے انکار، سلف صالحین پر بے اعتمادی اور بے اعتمادی سے آگے گزر کے بے احترامی کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور یہ بڑی خطرناک اور اندوہناک بات ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام p کے بارے میں بھی غیر مقلد اہل علم کی زبان حد احتیاط سے گذر جاتی ہے۔ مثلاً نواب وحید الزماں حیدر آبادی نسبتاً محتاط اور معتدل غیر مقلد علماء میں شمار کئے جاتے ہیں، صحابہ کے بارے میں ان کا تاثر یہ تھا ''کچھ صحابہ فاسق تھے جیسا کہ ولید اور اس کے مثل کہا جاوے گا معاویہ عمرو، مغیرہ، سمرہ کے حق میں ''**لایجوز لھم الترضی**'' ''ان کو رضی اللہ عنہ کہنا جائز نہیں''۔ [3] انہیں صاحب کا بیان ہے: اس میں کچھ شک نہیں کہ معاویہ اور عمرو بن عاص دونوں باغی، سرکش اور شریر تھے''۔[4]

یہ بات عجیب لگتی ہیں کہ جیسے حضرت امام ابوحنیفہ l کے عہد میں روافض کو آپ l سے عناد اور ہندوستان میں سب سے پہلے شیعہ و

[1] الفیصلۃ الحجازیۃ: ص٦۔

[2] الاربعین، ص ٣۔

[3] نزل الابرار٩٤۔

[4] رسائل اھلحدیث ٩٢۔

روافض ہی نے امام ہمام کے خلاف قلم اٹھایا[1] اسی طرح غیر مقلد حضرات، جو اس زمانہ میں امام صاحب کے خلاف دریدہ دہنی کررہے ہیں ...... بھی فکری اور فقہی اعتبار سے روافض سے ایک طرح کا قرب رکھتے ہیں، نواب وحید الزماں صاحب کا نقطۂ نظر ملاحظہ ہو:۔

''امام جعفر صادق مشہور امام ہیں بارہ اماموں میں سے، اور بڑے ثقہ اور فقیہ اور حافظ تھے، امام مالک اور امام ابوحنیفہ l کے شیخ ہیں، اور امام بخاری l کو معلوم نہیں کیا شبہ ہوگیا کہ وہ اپنی صحیح میں ان سے روایت نہیں کرتے .... اللہ تعالیٰ امام بخاری l پر رحم کرے، مروان اور عمران بن حطان اور کئی خوارج سے تو انہوں نے روایت کی اور امام جعفر صادق سے جو ابن رسول اللہ ہیں ان کی روایت میں شبہ کرتے ہیں''۔ [2]

ایک دوسرے مقام پر رقمطراز ہیں:۔

''اور بخاری l پر تعجب ہے کہ انہوں نے امام جعفر صادق سے روایت نہیں کی اور مروان وغیرہ سے روایت کی جو اعداء اہل بیت e تھے''۔ [3]

یہ بارہ امام کا تصور بالکل شیعہ حضرات کا ہے اور حضرات اہل بیت کے لئے '' h'' کے لفظ کا استعمال بھی قابل توجہ ہے! ...... نواب صاحب نے اپنی کتاب ''ھدیۃ المھدی'' میں تفصیل سے اہل تشیع کے بارہ اماموں کا ذکر فرمایا ہے اور اخیر میں دعا کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان بارہ اماموں کے ساتھ میرا حشر کرے۔ [4]

; ایک غیر مقلد عالم مولانا عبد الحق بنارسی کا حال یہ تھا کہ حضرت عائشہ R کے بارے میں کہتے تھے کہ انہوں نے حضرت علی r سے

[1] دیکھئے: مولانا عبدالرحمٰن پانی پتی کی کشف الحجاب: ٩۔

[2] لغات الحدیث ٦١/١۔

[3] حوالۂ سابق ١٠٣/٢۔

[4] ھدیۃ المھدی ١٠٣/۔

جنگ کر کے ارتداد کیا اور اگر بلا توبہ ان کی موت ہوئی ہو تو یہ کفر پر موت ہے (والعیاذ باللہ) شاہ عبدالعزیز دہلوی l کے شاگرد رشید مولانا عبدالرحمان پانی پتی نے مولانا بنارسی سے اس کو نقل کیا ہے 🗀

; ایک غیر مقلد عالم خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق r کی (نعوذ باللہ) کم علمی کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں:۔

''پس آؤ سنو، بہت صاف صاف اور موٹے موٹے مسائل ایسے ہیں کہ حضرت فاروق r نے ان میں غلطی کی، ان مسائل کے دلائل سے حضرت فاروق اعظم r بے خبر تھے''۔ 🗎

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی باتیں ان حضرات سے بعید از قیاس نہیں ہیں، کیوں کہ یہ تراویح کی ۲۰ رکعات کو ''بدعتِ عمری'' اور جمعہ کی اذانِ ثانی کو ''بدعتِ عثمانی'' کہتے ہیں اور معلوم ہے کہ بدعت بدترین گناہ اور موجب فسق ہے تو کم علمی کی بات تو بہرحال اس سے کم تر ہے۔

; بدگمانی اور بے احترامی کی کوئی منزل نہیں ہوتی، جہاں کچھ غیر مقلد اہل علم نے عام صحابہ کو ہدف طعن بنایا وہیں بعض حضرات نے حضرات اہل بیت کی شان میں وہ کچھ کہا جو کسی طرح خانوادۂ نبوی s کے شایان شان نہیں، حکیم فیض عالم پاکستان کے ایک غیر مقلد عالم ہیں، وہ خلیفۂ راشد سیدنا حضرت علی r کے بارے میں رقم طراز ہیں:۔

''سیدنا علی کے خود ساختہ حکمرانہ عبوری دور کو خلافت راشدہ میں شمار کرنا صریحاً بددیانتی ہے مگر اغیار نے جس چابک دستی سے آنجناب کی نام نہاد خلافت کو خلافت حقہ ثابت کرنے کے لئے دنیا کے سبائیت سے درآمد مواد سے جو کچھ تاریخ کے صفحات

🗀 کشف الحجاب ۲۱۔

🗎 طریق محمدی ٥٤۔

First Proof	15-06-09
Second Proof	05-08-09
FINAL	00-00-00
TOTAL-PAGE	

میں قلم بند کیا ہے، اس کا حقیقت سے قطعاً کوئی تعلق یا واسطہ نہیں''۔

(خلافت راشدہ ٦٥)

; حضرت حسن و حسین q ......جن کو آپ s نے نوجوانان جنت کا سردار قرار دیا...... کے بارے میں انہیں صاحب کا بیان ہے:

''حضرات حسنین کو زمرۂ صحابہ میں شمار کرنا صریحاً سبائیت کی ترجمانی ہے یا اندھا دھند تقلید کی خرابی''۔ (سیدنا حسن بن علی ٣٦)

; یہی مصنف حضرت ابو ذر غفاری ; r کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''ابن سبا کے کمیونسٹ نظریہ سے متاثر ہو کر کھاتے پیتے۔
مسلمان کے پیچھے لٹھ لے کر بھاگ اٹھتے تھے''۔ (خلافت راشدہ: ٤٣)

; ایک اور غیر مقلد عالم مولانا امین احسن اصلاحی صحابی رسول s حضرت ماعز r کے بارے میں رقمطراز ہیں:..................

''اس کا کردار نہایت بدخصلت گنڈے کا کردار تھا، نبی کریم s اور آپ s کے صحابہ p کسی غزوہ کیلئے نکلتے تو مردوں کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر یہ جنس زدہ بدمعاشوں کی طرح عورتوں کا تعاقب کرتا''۔

(تدبرِ قرآن ٥/ ٣٧٠)

یہی صاحب صحابیۂ رسول حضرت غامدیہ R کو آزاد قسم کی بدپیشہ عورت قرار دیتے ہیں۔ (حوالہ سابق ٥/ ٣٧٦)

غیر مقلدیت کے تحریک کا اصل دعویٰ تو یہ تھا کہ ہم صرف حدیث پر عمل کریں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دانستہ یا نادانستہ ان حضرات نے حدیث کے اعتماد واعتبار کو جو نقصان پہنچایا ہے، شاید کسی اور طبقہ سے پہنچا ہو، ہندو پاک میں اکثر منکرین حدیث کا خمیرہ غیر مقلدیت ہی سے بنا ہے، پہلے قلم ان احادیث ثابتہ کے خلاف اٹھتا تھا جو فقہ حنفی کے لئے تقویت کا باعث تھیں مگر نفی و انکار کی اس دھن میں شاید ہی کسی مجموعۂ

حدیث کی آبرو بچ جائے۔

; بخاری شریف میں حضرت عائشہ R پر افک (تہمت اندازی) کی حدیث آئی ہے، یہ حدیث ام المومنین کی طہارت و پاکیزگی اور عفت مآبی کو ظاہر کرتی ہے، ایسی شانِ عفت کہ قرآن مجید میں اس کے ذکر کی وجہ سے اب اس کا انکار کفر ہے، لیکن حکیم فیض عالم صاحب اسی حدیث کے روایت کرنے کی وجہ سے امام بخاری پر از حد خفا ہیں اور کہتے ہیں:

''ان محدثین، ان شارحین حدیث، ان سیرت نویس اور ان مفسرین کی تقلیدی ذہنیت پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے جو اتنی بات کا تجزیہ یا تحقیق کرنے سے بھی عاری تھے کہ یہ واقعہ سرے سے ہی غلط ہے، لیکن اس دینی و تحقیقی جرأت کے فقدان نے ہزاروں المیہ پیدا کئے اور پیدا ہوتے رہیں گے۔ ہمارے امام بخاری I نے اپنی صحیح بخاری میں جو کچھ درج فرما دیا وہ صحیح اور لاریب ہے خواہ اس سے اللہ تعالیٰ کی الوہیت، انبیائے کرام کی عصمت، ازواج مطہرات کی طہارت کی، فضائے بسیط میں دھجیاں بکھرتی چلی جائیں، کیا یہ امام بخاری I کی اسی طرح تقلید جامد نہیں جس طرح مقلدین ائمہ اربعہ کی تقلید کرتے ہیں؟''

دورانِ بحث لکھتے ہیں:

''دراصل امام بخاری میرے نزدیک اسی روایت کے معاملہ میں مرفوع القلم ہیں''۔

معلوم ہے کہ ''مرفوع القلم'' غیر مکلّف نابالغ اور پاگل کو کہا جاتا ہے۔

; ''امام ابوعیسیٰ ترمذی کے مجموعۂ حدیث، سنن ترمذی'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''امام مسلم سے تقریباً ۲۱/ برس بعد ابوعیسیٰ محمد ترمذی نے یہ وضعی روایات اپنی

صدیقۂ کائنات ۱۰۶۔

حوالہ سابق۔

24

J:\2009\ZamZam\Rah-e-Aetidal\1st Proof Chp-1-ok..........(15-06-09)

First Proof	15-06-09
Second Proof	05-08-09
FINAL	00-00-00
TOTAL-PAGE	

کتاب میں درج کی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ امام مسلم کی وفات کے بعد کسی سبائی ٹکسال میں انہیں گھڑا گیا ہے''۔

; مسند امام احمد بن حنبل اہل سنت والجماعۃ کی احادیث کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے، اس کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

''مسند امام احمد بن حنبل کا جامع اول ابوبکر شافعی کے نام سے مشہور ہے، حقیقت میں یہ شخص رافضی تھا اور بظاہر شافعی بنا ہوا تھا............ مسند کا جامع دوم ابوبکر قطیعی (متوفی ۳۶۸ھ) ہے، یہ بھی شیعہ تھا ان دونوں شیعوں نے امام احمد اور ان کے بیٹے عبداللہ سے کچھ حدیثیں لے کر ان میں جابجا اپنے مسلک کے مطابق محو و اثبات کر کے شیعی روایات کے الفاظ کو بدل کر اپنی خود ساختہ حدیثوں کے مناسب اسناد جوڑ کر چھ جلدوں میں ایک ضخیم مجموعۂ احادیث مدون کر ڈالا''۔

ابن شہاب زہری وہ بلند پایہ محدث ہیں، جن کو ''اولین مدون حدیث'' کہا گیا ہے، **اوّل من دوّن الحدیث** ...... یہ تمام کتب احادیث کے ایک مرکزی راوی ہیں، لیکن بعض غیر مقلد اہل علم کی نظر عنایت سے یہ بھی محفوظ نہیں ہیں، حکیم محفوظ عالم صاحب کا خیال ہے کہ:

''ابن شہاب منافقین و کذابین کے دانستہ نہ سہی، نادانستہ ہی سہی مستقل ایجنٹ تھے، اکثر گمراہ کن، خبیث اور مکذوبہ روایتیں انہیں کی طرف منسوب ہیں''۔

غور فرمایئے کہ جب حدیث کے تمام ذخیرے ہی نامعتبر ٹھہریں اور فقہ و حدیث کی بڑی بڑی شخصیتوں ہی کو مجروح کر دیا جائے تو اب ایسی روایتوں پر کون اعتبار کرے گا؟............ کیا یہی حدیث کی خدمت ہے؟۔

صدیقۂ کائنات: ۱۰۸۔

خلافت راشدہ ۱۱۸/۔

صدیقہ کائنات ۸۰۔

اسی لئے ایک معروف غیر مقلد مولانا قاضی عبدالواحد خانپوری اپنی جماعت کے فکری بے سمتی بلکہ فکری آوارگی کا رونا اس طرح روتے ہیں:۔

''پس اس زمانہ کے جھوٹے اہلحدیث مبتدعین، مخالفین سلف صالحین جو حقیقت ماجاء بہ الرسول سے جاہل ہیں، وہ صفت میں وارث وخلیفہ ہوئے ہیں شیعہ وروافض کے، یعنی جس طرح شیعہ پہلے مسلمانوں میں باب اور دہلیز کفر ونفاق تھے اور مدخل (دروازہ) ملاحدہ اور زنادقہ منافقین کے مثل اہل تشیع کے، پھر ملاحدہ مرزائیہ قادیانیہ نکلے تو انہوں نے بھی ان ہی کے باب اور دہلیز اور مدخل سے داخل ہونا اختیار کیا اور جماعات کثیرہ کو ایمان سے مرتد اور منافق بنایا اور جب ملاحدہ زنادقہ چکڑالویہ نکلے تو بھی ان ہی کے دہلیز اور دروازہ سے داخل ہوئے اور ایک خلق کو ان سے مرتد بنایا اور جب یہ مولوی ثناء اللہ خاتم الملحدین نکلا تو وہ بھی جہاں اہلحدیث کے باب اور دہلیز سے داخل ہوکر کیا جو کچھ کیا''۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی بہت سی مثالیں موجود ہیں جن کا تذکرہ بھی اس حقیر کے لئے بار خاطر ہے اور خدانخواستہ ایسا نہیں ہے کہ تمام غیر مقلدین گمراہی کے دروازہ پر کھڑے ہیں، ان میں مخلصین وصالحین بھی ہیں اور بعض معتدل الفکر حضرات بھی ہیں، (گو اس گروہ میں عام طور پر فکری اعتدال اور حکیمانہ طرز عمل کا فقدان ہے) اس تحریر سے ان بھائیوں کی دل آزاری ہرگز مقصود نہیں بلکہ مقصود محض اس قدر ہے کہ ٹھنڈے دل سے غیر جذباتی ہوکر اس مسئلہ پر غور کریں اور دیکھیں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ تقلید سے آزادی کی یہ راہ بد دینی اور ہویٰ پرست لوگوں کے لئے خود دین سے آزادی کا ایک ذریعہ بن جائے۔ انشاء اللہ غور وفکر کی نظر اور نصح وخیر خواہی کا جذبہ ہمارے مخلص غیر مقلد بھائیوں کو بھی سوچنے پر مجبور کرے گا کہ تقلید اس زمانہ میں ہدایت پر استقامت اور گمراہی سے حفاظت کا ذریعہ ہے۔

کتاب التوحید والسنۃ فی رد اہل الالحاد والبدعۃ ۶۲۔۶۳۔

25
J:\2009\ZamZam\Rah-e-Aetidal\1st Proof Chp-1-ok.........(15-06-09)

First Proof	15-06-09
Second Proof	05-08-09
FINAL	00-00-00
TOTAL-PAGE	

علامہ اقبال بھی ایک زمانہ میں تقلید کے بڑے مخالف تھے لیکن بالآخر تجربات نے ان کو اپنی رائے بدلنے پر مجبور کردیا، اور اقبال نے کہا:۔

اجتہاد اندر زمانِ انحطاط — قوم را برہم ہمی پیچد بساط
زاجتہاد عالمانِ کم نظر — اقتداء برر فتگان محفوظ تر

کہیں تقلید کو امت کی جمعیت کے قائم رہنے کا رمز قرار دیتے ہیں:

مضمحل گردد چو تقویم حیات — ملت از تقلید می گیرد ثبات
راہ آباء رو کہ ایں جمعیت است — معنی تقلید ضبط ملت است

تقلید شخصی اور حدیث:

تقلید شخصی کے واجب ہونے پر یہی دلیل کافی ہے لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ عہد رسالت اور عہد صحابہ میں تقلید شخصی کی کوئی نظیر نہیں رسول اللہ s نے حضرات معاذ ابن جبل r کو یمن بھیجا، تاکہ وہ وہاں انتظامی امور کو بھی انجام دیں اور مسلمانوں کی دینی رہنمائی کا فریضہ بھی انجام دیں، اسی لئے آپ s نے حضرت معاذ r سے دریافت فرمایا کہ اگر کوئی معاملہ پیش آئے تو کس طرح اس کا فیصلہ کروگے؟ عرض کیا: کتاب اللہ کے ذریعہ، فرمایا: اگر کتاب اللہ میں نہ مل پائے؟ عرض کیا: سنت رسول s کے ذریعہ، ارشاد فرمایا: اگر سنت رسول میں بھی نہ مل پائے حضرت معاذ نے عرض کیا کہ اجتہاد کروں گا۔ اور اس میں کوئی کوتاہی نہیں کروں گا۔ آپ s نے ان کے سینہ پر مارا اور فرمایا: اللہ کا شکر ہے جس نے رسول اللہ s کے قاصد کو اس بات کی توفیق دی کہ جس سے خود اللہ کا رسول s راضی ہے۔ ''**الحمد للّٰہ الذی وفق رسول رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بمایرضی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم**''۔ ظاہر ہے حضور s کا تنہا حضرت

ابوداؤد، کتاب الاقضیہ، باب اجتہاد الرای فی القضاء ۲/۵، ۵۔

معاذ کو بھیجنا اوران کو مسلمانان یمن پر رہنما بنانا، مسلمانان یمن کے لئے اس بات کی تعلیم ہے کہ وہ حضرت معاذ کے فتاویٰ پر عمل کریں اور اسی کا نام تقلید شخصی ہے کہ آدمی اپنے مسائل میں کسی ایک مجتہد کی طرف رجوع کرے............اور یہ کچھ حضرت معاذ ہی پر موقوف نہیں، آپ s نے ہجرت سے پہلے حضرت مصعب بن عمیر r کو اہل مدینہ کی تعلیم کے لئے مدینہ بھیجا، اسی طرح وقتاً فوقتاً مختلف صحابہ p کو مختلف علاقوں اور مختلف قبائل میں تبلیغ اور تعلیم کے نقطۂ نظر سے روانہ فرمایا، ظاہر ہے کہ اس علاقہ اور قبیلہ کے مسلمان شرعی احکام و مسائل میں انہیں سے رجوع کرتے تھے، اور انہیں کے فتاویٰ کی اتباع کرتے تھے، یہی تقلید شخصی ہے۔

حضرت حذیفہ r سے مروی ہے کہ آپ s نے فرمایا:

"انی لاادری مابقائ فیکم فاقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر وعمر" 🗀

ترجمہ: مجھے نہیں معلوم کہ کب تک تمہارے درمیان زندہ رہوں گا، لہذا میرے بعد حضرت ابوبکر وعمر کی اقتداء کرنا۔

ظاہر ہے کہ اقتداء سے مراد احکام دین میں کسی کی پیروی کرنے کے ہوتے ہیں، یہی تقلید شخصی ہے کہ کسی خاص شخص کے علم وتقویٰ پر اعتماد کرتے ہوئے اس کی پیروی کی جائے، گویا اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ s کے بعد عہد صحابہ میں جو لوگ خود اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے، اگر وہ حضرت ابوبکر r وعمر r کی تقلید شخصی کرلیتے تو یہ کافی ہوجاتا لیکن چونکہ یہ زمانہ حضور s سے قریب تر تھا بہت سے فقہاء ومجتہدین موجود تھے، خیر کا غلبہ تھا اور ہوا پرستی بھی اس درجہ نہ تھی جو اس زمانہ میں ہے، اس لئے یہ حکم وجوب کے درجہ میں نہیں تھا۔

🗀 ترمذی ۲۰۷/۲، مناقب ابی بکر الصدیق۔

آپ s نے حضرت عبداللہ ابن مسعود r کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ تمہارے لئے جو چیز عبداللہ ابن مسعود r پسند کریں اسے میں نے پسند کیا **رضیت لکم مارضی لکم ابن ام عبد** 🗀 یہ گویا آپ s کی طرف سے حضرت عبداللہ بن مسعود r کی تقلید واقتداء کے جائز ہونے کا اعلان اور اپنی طرف سے فقہ ابن مسعود r توثیق وتصدیق ہے۔

تقلید شخصی............عہد صحابہ p میں:

عہد صحابہ میں بھی تقلید شخصی کی نظریں مل جاتی ہیں، حضرت عبداللہ ابن عباس r سے مروی ہے کہ حضرت عمر r نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ جس کو قرآن کے بارے میں کچھ پوچھنا ہو وہ ابی ابن کعب r کے پاس جائے، جس کو فرائض ومیراث کے بارے میں معلوم کرنا ہو، اسے زید بن ثابت کے پاس جانا چاہئے اور جسے کوئی فقہی مسئلہ دریافت کرنا ہو، اسے حضرت معاذ ابن جبل r کے پاس جانا چاہئے، پھر ازراہ تواضع فرمایا کہ اور اگر کسی کو مال طلب کرنا ہو تو وہ میرے پاس آئے، کیونکہ اللہ نے مجھے اس پر نگراں اور تقسیم کنندہ بنایا ہے۔ 🗎............حضرت عمر r کا یہ ارشاد گویا عام لوگوں کو فرائض میں حضرت زید بن ثابت r اور عام احکام میں معاذ ابن جبل r کے فتاویٰ پر اعتماد کی تلقین تھی۔

حضرت عمر r نے جب عمار بن یاسر r کو کوفہ کا امیر بنا کر اور حضرت عبداللہ ابن مسعود r کو معلم اور وزیر بنا کر بھیجا تو اہل کوفہ کے نام خط لکھا کہ یہ بدری صحابہ ہیں لہٰذا ان کی اقتداء کرو اور ان کی بات سنو **"فاقتدوا بھما واسمعوا من قولھما"** .... اس میں گویا اہل کوفہ کو اس بات کی تلقین فرمائی گئی ہے کہ وہ ان حضرات کی فتاویٰ پر عمل کیا کریں اور خود رائی نہ برتیں۔

🗀 مستدرك حاكم ص: ۳۱۹۔ ج: ۳۔

🗎 مجمع الزوائد ۱۳۵/۱۔

حضرت صحابہ p کے زمانے میں بہت سے مجتہدین کی موجودگی نیز خداترسی اور بحیثیت مجموعی خیر کے غلبہ کی وجہ سے تقلید شخصی کی زیادہ حاجت نہیں تھی لیکن اس کے باوجود فی الجملہ تقلید شخصی کا تصور اس عہد میں بھی موجود تھا۔ مثلاً حضرت عبداللہ ابن عباس r سے اہل مدینہ نے اس عورت کے بارے میں دریافت کیا جس نے طواف زیارت کرلیا ہو اور اس کے بعد حیض شرع ہوگیا ہو، حضرت ابن عباس r نے فرمایا کہ وہ طواف وداع کو چھوڑ کر واپس جاسکتی ہیں لیکن اہل مدینہ نے ان کی رائے کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور کہا کہ یہ ہونہیں سکتا کہ ہم آپ کی رائے کو لے لیں اور حضرت زید بن ثابت r کی رائے کو چھوڑ دیں ”**لانأخذ بقولک وندع قول زید**“۔

اسی طرح حضرت ابوموسیٰ اشعری r سے ایک مسئلہ دریافت کیا گیا۔ آپ r نے اپنی رائے کے مطابق مسئلہ بتادیا، لیکن فرمایا کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود r کی نسبت سے فرمایا کہ جب تک تمہارے درمیان یہ متبحر عالم موجود ہے، مجھ سے مسئلہ دریافت نہ کیا کرو ”**لا تسئلونی مادامم هذا الحبر فیکم**“.

خود حضرت عبداللہ ابن مسعود r کا حال یہ تھا کہ ان کی اور حضرت عمر r کی رائے میں بڑا توافق پایا جاتا تھا اور کہیں ان کی اور حضرت عمر r کی رائے میں اختلاف ہوتا تو اپنی رائے پر حضرت عمر r کی رائے کو ترجیح دیتے، یہاں تک کہ امام شعبی l کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود r (فجر میں) دعائے قنوت نہیں پڑھتے تھے، اگر حضرت عمر r پڑھتے ہوتے تو ضرور تھا کہ آپ r نے بھی پڑھا ہوتا ”**ولو قنت عمر لقنت عبداللّٰہ**“.

بخاری، باب اذا حاضت المرأة بعد ماافاضت۔

بخاری، کتاب الفرائض، باب میراث ابنة ابن مع ابنةٍ ۲/۹۹۷۔

اعلام الموقعین ۱/۱۶۔

تقلید شخصی......محدثین اور سلف صالحین کا تعامل:

تقلید کے جائز اور درست ہونے کے لئے یہی بات کافی ہے کہ سلف صالحین کا ہمیشہ سے اس پر عمل رہا ہے، گو تقلید شخصی کا عموم چوتھی صدی ہجری میں ہوا جس کی طرف حضرت شاہ ولی اللہ l نے اشارہ فرمایا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دوسری ہی صدی سے تقلید کا رواج ہو چکا تھا اور بڑے بڑے اہل علم، محدثین اور فقہاء......بھی تقلید ہی پر عامل تھے۔ بطورِ نمونہ چند اہم نام یہاں ذکر کئے جاتے ہیں:

1 لیث ابن سعد (متوفی ۱۷۵ھ) بڑے محدث اور فقیہ تھے، وہ حنفی المسلک تھے، مشہور غیر مقلد عالم نواب صدیق حسن خاں کے الفاظ میں ”وے حنفی مذہب بود وقضائے مصر داشت“۔

2 امام عبداللہ بن مبارک l جماعت محدثین کے سرخیل ہیں۔ ۱۸۱ھ میں وفات پائی، وہ بھی امام ابوحنیفہ l کے اصحاب ومقلدین میں ہیں۔

3 وکیع بن جراح l (متوفی ۱۹۷ھ) بڑے بلند پایہ محدث ہیں اور امام شافعی l جیسے جلیل القدر محدث اور فقیہ ان کے تلامذہ میں ہیں، یہ بھی امام ابوحنیفہ l کے مقلد تھے، حافظ ذہبی کا بیان ہے ”**کان یفتی بقول ابی حنیفة**“ اور حافظ ابن عبدالبر لکھتے ہیں: ”**کان یفتی برأی ابی حنیفة**“.

4 یحییٰ بن سعید القطان l جن کی وفات ۱۹۸ھ میں ہوئی، فنِ

اتحاف ۲۳۷۔

شرح مؤطا للباجی مالکی، ۷/ ۳۰۰، مفتاح السعادة ۲/ ۱۱۲۔

تذکرة الحفاظ ۱/ ۲۸۲۔

جامع بیان العلم ۱/ ۱۴۹۔

رجال کے پہلے ناقد اور سید الحافظ ہیں، یہ بھی حنفی ہیں، حافظ ذہبی ا اور حافظ ابن حجر ا کا بیان ہے "یفتی بقول ابی حنیفة".[1]

5 یحییٰ بن معین ا (متوفیٰ ۲۳۳ھ) جرح وتعدیل کے امام اور حدیث میں استاذ الاساتذہ ہیں، ان کے بارے حافظ ذہبی ا کا بیان ہے کہ ان کا شمار غالی حنفیوں میں تھا [2] چنانچہ یحییٰ بن معین خود فرمایا کرتے تھے کہ فقہ تو امام ابوحنیفہ کی فقہ ہے اور کہتے تھے کہ اسی پر ہم نے لوگوں کو پایا "الفقه فقه ابی حنیفة علیٰ هٰذا ادركت الناس".[3]

6 امام محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم (متوفیٰ ۲۰۸ھ) کا شمار بڑے حفاظِ حدیث میں ہے، یہ فقہِ مالکی کے پیرو تھے "احد فقهاء المصر من اصحابِ مَالک"[4]

7 امام ابوبکر احمد ابن محمد اثرم ا (متوفی ۲۶۰ھ) بڑے محدثین میں شمار کئے جاتے ہیں، یہ امام احمد ابنِ حنبل ا کے پیرو تھے۔[5]

8 امام ابوبکر احمد بن محمد المروزی (متوفیٰ ۲۷۵ھ) بڑے ائمہ حدیث میں ہیں اور حنبلی المذہب ہیں۔ "اجل اصحاب احمد ابن حنبل ا".[6]

9 مشہور محدث امام بخاری ا (متوفیٰ ۲۵۶ھ) کو علامہ سبکی ا نے فقہائے شوافع میں شمار کیا ہے [7] نیز غیر مقلد عالم نواب صدیق حسن

[1] تذکرة الحفاظ ۱/ ۲۸۲۔ تهذيب التهذيب ۲/ ۴۵۰۔
[2] مقدمه نصب الرايه ۱/ ۴۲۔
[3] تبييض الصحيفة ۱۱۵۔
[4] تذکرة الحفاظ ۲/ ۱۱۶۔
[5] تذکرة الحفاظ ۲/ ۱۳۵۔
[6] حوالهٔ سابق ۲/ ۱۸۵۔
[7] دیکھئے: طبقات الشافعيه الكبرىٰ ۱/۲، مطبوعه مصر۔

خاں صاحب ا کو بھی ان کے شافعی المذہب ہونے کا اعتراف ہے[1]

- امام ابوداؤد ا (متوفیٰ ۲۷۵ھ) کے بارے میں نواب صدیق حسن خاں کے بقول اختلاف ہے کہ وہ شافعی تھے یا حنبلی [2] گویا تھے بہرحال مقلد ہی۔

q امام محمد ابن شعیب نسائی ا (متوفی ۳۰۳ھ) جو سننِ نسائی کے مؤلف ہیں، فقہ شافعی ا کے مقلد تھے، خود نواب صاحب کو اعتراف ہے کہ یہ شافعی المذہب تھے "وکان شافعی المذہب"۔[3]

w مشہور محدث ابوعوانہ اسفرائنی ا (متوفیٰ ۳۱۶ھ) جن کی کتاب صحیح ابوعوانہ ہے، شافعی المسلک تھے، خود حافظ ذہبی نے اس کا ذکر کیا ہے۔[4]

e امام طحاوی ا (متوفیٰ ۳۲۱ھ) بڑے پایہ کے محدث ہیں اور مشکلات حدیث کے حل میں ان کا جواب نہیں، حنفی المسلک تھے۔[5]

r امام اسحاق ابن راہویہ کو سبکی ا نے شوافع میں شمار کیا ہے۔[6]

t محدث دارقطنی (متوفی ۳۸۵ھ) بھی شوافع میں شمار کئے گئے ہیں۔[7]

y امام بیہقی (متوفی ۴۵۸ھ) شافعی ہیں اور ان کی شافعیت ان کی کتاب ہی سے ظاہر ہے۔

[1] ابجد العلوم: ۸۱۰۔
[2] الحطة فی ذکر صحاح السته: ۲۴۹۔
[3] حواله سابق: ۲۵۴۔
[4] تذکرة الحفاظ: ۳/۲۔
[5] تذکرة الحفاظ: ۳/ ۲۸۸۔
[6] طبقات الشافعيه: ۱/ ۲۳۲۔
[7] حواله سابق: ۲/ ۳۱۰۔

یہ وہ لوگ ہیں جو سرگروہِ محدثین ہیں، بعد کے اہلِ علم جیسے حافظ ابن عبدالبر مالکی، صاحبِ شرح السنۃ امام بغوی شافعی، ابن عساکر شافعی، ابوبکر حازمی شافعی، شیخ عبدالقادر جیلانی حنبلی، حافظ عزالدین عبدالسلام شافعی، صاحب ''علوم الحدیث'' ابن صلاح شافعی، امام ابوزکریا نووی شافعی، امام محبّ الدین طبری شافعی، حافظ زین الدین عراقی شافعی، ابن دقیق العید شافعی، زیلعی حنفی، حافظ قطلو بغا حنفی، حافظ ابن حجر شافعی اور دوسرے اہلِ علم کا ذکر کیا جائے تو یہ فہرست بہت طویل ہو جائے گی، شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ ا اور حافظ ابن قیم ا نے بھی تقلید میں غلو کو ناپسند کیا ہے، اور چونکہ ان کو اپنے عہد میں ایسے ہی غالی مقلدین سے سابقہ پیش آیا تھا، اس لئے ان کا یہ ردِ عمل فطری اور حق بجانب تھا، ورنہ اصحابِ علم وار بابِ نظر پر یہ بات مخفی نہیں کہ یہ دونوں حضرات بھی دراصل حنبلی المسلک تھے، البتہ بعض مسائل میں اپنی خود رائے رکھتے تھے اور وہ اس مقام و مرتبہ کے عالم تھے کہ اس کا حق رکھتے تھے، خود نواب صدیق حسن خاں نے ابن تیمیہ ا کو ''شیخ الحنابلۃ'' قرار دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سوائے ابوداؤد ظاہری، علامہ ابن حزم اور علامہ شوکانی ا کے شاید ہی کوئی قابلِ ذکر عالم مل پائے جس نے تقلید کا راستہ اختیار نہ کیا ہو۔

اگر یہ بات عرض کی جائے کہ خود شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی ا بھی مقلد ہی تھے اور مسلکِ حنبلی کے پیرو تھے تو شاید غیر مقلد بھائیوں کو ناگواری ہوگی، لیکن کیا کیا جائے کہ حقیقت یہی ہے، خود شیخ کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

ونحن ایضًا فی الفروع علیٰ مَذهب الامام احمد ابن

الجُنة لاهلِ السنة ۳۸۔

حنبل ولا ننكر علىٰ من قلد الائمة الاربعة دون غيرهم لعدم ضبط مذاهب الغير كالرافضة والزيدية والامامية ونحوهم لانقرهم علىٰ شئٍ من مذاهبهم الفاسدة بل نجبرهم علىٰ تقليد الائمة الاربعة ولا نستحق مرتبة الاجتهاد ولا احمد منا يدّعيه الا ان فى بعض المسائل اذا صح لنا نص جلى من كتابٍ او سنَّةٍ غير منسوخٍ ولا مخصص ولا معارض باقوىٰ منه وقبل به احد الائمة الاربعة اخذنا به وتركنا المذهب الخ.

ترجمہ: نیز ہم فروعی مسائل میں امام احمد ابن حنبل ا کے مذہب کے پابند ہیں اور ہم ان لوگوں پر جو صرف ائمۂ اربعہ کی تقلید کرتے ہیں اوروں کی نہیں کرتے کوئی انکار نہیں کرتے اس لئے کہ یہ دوسرے مذاہب منضبط نہیں ہیں جیسا کہ رافضیوں زیدیہ اور امامیہ وغیرہم کے مذاہب، ہم ان کو ان مذاہبِ فاسدہ کی کسی چیز پر برقرار نہیں رہنے دیں گے بلکہ ہم ان کو مجبور کریں گے کہ وہ حضراتِ ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید کریں، ہم مرتبۂ اجتہاد کے مستحق نہیں ہیں اور نہ ہم میں سے کوئی اس کا مدعی ہے مگر یہ کہ بعض مسائل میں جب ہمارے سامنے کتاب وسنت کی کوئی واضح نص آجائے جو منسوخ اور مخصوص نہ ہو اور اس کا اس سے قوی تر نص سے معارضہ بھی نہ ہو اور حضرات ائمہ اربعہ میں سے کسی نے قبول بھی کیا ہو تو ہم اس کو لیتے ہیں اور اپنے مذہب کو ترک کرتے ہیں۔

ظاہر ہے محدثین، فقہاء، مجددین امت، اہل علم اور اہلِ دل کا تقلید پر قناعت کرنا بجائے خود تقلید کے ثبوت کے لئے کافی وشافی ہے اور اگر تقلید کو شرک سمجھا جائے جیسا

شیخ احمد ابن حجر: الشیخ محمد بن عبدالوهاب عقیدته السلفیة ودعوته الاصلاحیة وثناء العلماء علیه ص ۵٦۔

کہ غیر مقلد حضرات کہتے ہیں تو یہ تمام سلفِ صالحین نعوذ باللہ مشرکین کی فہرست میں داخل ہوجائیں گے................؟

ائمہ اربعہ ہی کی تقلید کیوں؟

اب ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اس تقلید کو ائمہ اربعہ، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد M تک کیوں محدود کردیا گیا اور دوسرے ائمہ وفقہاء کی تقلید کی کیوں اجازت نہیں؟ تو حقیقت یہ ہے کہ تقلید کا ائمہ اربعہ میں منحصر ہوجانا یہ خود منجانب اللہ ہے، کیونکہ دوسرے فقہاء ومجتہدین کی فقہ آج مرتب اور مکمل صورت میں ہمارے سامنے موجود نہیں ہے، کسی کی رائے سو (١٠٠) مسئلہ میں منقول ہے، کسی کی پچاس (٥٠) میں، کسی کی اس سے کم میں اور کسی کی اس سے زیادہ میں، ظاہر ہے کہ ایسے فقہاء کی تقلید زندگی کے تمام مسائل میں مفید اور کافی نہیں ہوسکتی، ائمہ اربعہ کی فقہ مرتب اور محفوظ شکل میں ہم تک پہنچی ہے اور ان مکاتبِ فقہ کے علماء کی مسلسل کوششوں نے ان فقہی مذاہب کو ایک مکمل اور مرتب قانونِ زندگی کی صورت دے دی ہے، اس لئے اب ان کی تقلید کے سوا چارہ نہیں، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ا جو ہندوستان کے تمام مکاتبِ فکر کے درمیان ایک متفق علیہ شخصیت ہیں اور خود غیر مقلد حضرات ان کو اپنی جماعت کا ایک اہم ستون شمار کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

منها ان هذه المذاهب الاربعة المدونة المحررة قد اجتمعت الامة او من يعتد منها علىٰ جواز تقليدها الىٰ يومنا هذا وفى ذٰلك من المصالح مالا يخفى سيما فى هٰذه الايام التى قصرت فيها الهمم جدا او اشربت النفوس الهوىٰ واعجب كل ذى رأىٍ برأيه.

حجة الله البالغة (مترجم) ١/ ٣٧٦۔

ان باتوں میں سے ایک یہ ہے کہ مذاہبِ اربعہ جو لکھی ہوئی مدون صورت میں موجود ہیں، پوری امت یا کم از کم امت کے قابلِ لحاظ طبقہ نے آج تک ان کی تقلید جائز ہونے پر اتفاق کیا ہے، ان میں جو مصلحتیں ہیں بالخصوص موجودہ حالات میں جب کہ ہمّتیں کوتاہ ہیں، ہویٰ پرستی کا دور ہے، اور ہر شخص اپنی رائے پر نازاں ہے، وہ مخفی نہیں۔

صدیوں سے اس پر امت کے ''سوادِ اعظم'' کا عمل ہے اور آپ s نے فرمایا کہ سوادِ اعظم کی اتباع کرنی چاہئے ''**اتبعوا السواد الاعظم**'' پہلے زمانہ میں صرف شیعہ ہی تھے جو ائمہ اربعہ کی تقلید پر معترض تھے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ ا فرماتے ہیں:

قال الرافضى ذهب الجميع منهم الى القول بالقياس والاخذ بالرأى فادخلوا فى دين الله تعالىٰ ماليس منه وحرفوا احكام الشريعة واتخذوا مذهب اربعة لم تكن فى زمن النبى ولا زمن الصحابة واعملوا اقاويل الصحابة مع انهم نصوا علىٰ ترک القياس وقالوا اول من قاس ابليس''.

ترجمہ: رافضی کہتے ہیں کہ تمام مقلدین قیاس کے قائل ہیں اور رائے کو لیتے ہیں، انہوں نے اللہ تعالیٰ کے دین میں وہ کچھ داخل کردیا جو دین میں نہیں، انہوں نے شریعت کے احکام بدل ڈالے اور چار مذاہب بنالئے، جو آنحضرت s اور صحابہ p کے زمانے میں نہیں تھے، حضرت صحابہ کرام p کے اقوال ان

ابن ماجه: ٢/ ٣٦٧، مع تحقيق: د، مصطفى اعظمى۔

منهاج السنة ٨٩/٢، ط: بولاق۔

مقلدین نے ترک کردیئے حالانکہ حضرات صحابہ p نے ترک قیاس کی
تصریح کی ہے اور یہ کہا ہے کہ سب سے پہلے جس نے قیاس کیا تھا وہ ابلیس تھا۔

پھر حافظ ابن تیمیہ l نے ان سوالات اور ائمہ رابعہ کی تقلید کے سلسلہ
میں شیعوں کے بعض اور اعتراضات کا مفصل اور تشفی بخش جواب دیا ہے، یہ وہی
اعتراضات ہیں جو آج کل غیر مقلد حضرات اٹھاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ائمہ اربعہ کے مذاہب نے کتاب وسنت کے مختلف پہلوؤں کو نیز
صحابہ کے مشہور ومستند فتاویٰ کو بڑی خوبصورتی سے اپنے اندر سمولیا ہے، دوسرے فقہاء کی
آراء محفوظ ومستند طریقہ سے کم پہنچ پائی ہیں، وہ مرتب ومدون صورت میں موجود نہیں
ہیں۔ جن دیگر فقہاء کی آراء کتابوں میں ملتی ہیں وہ زندگی کے تمام مسائل کا احاطہ نہیں
کرتیں، کسی کی رائے پچاس مسائل میں منقول ہے، کسی کی سودوسو مسائل میں، ظاہر ہے
کہ ایسا نا تمام اور تشنہ کام مجموعۂ قانون عام آدمی کی زندگی کے مسائل کا حل نہیں ہوسکتا۔

ائمہ اربعہ کو ایسے لائق رفقاء اور محنتی تلامذہ ملے کہ انہوں نے ان کی تمام آراء کو
ایک قانونی ترتیب کے ساتھ جمع اور مدون کردیا، جن مسائل میں ان کی ایک سے
زیادہ رائے منقول تھی، ان میں تطبیق یا دلائل وبراہین کی بناء پر ایک رائے کو ترجیح دی،
ان مجتہدین کے قرآن وحدیث، آثار صحابہ اور قیاس پر مبنی دلائل کی تحقیق وتوضیح عمل
میں آئی اور ان ائمہ متبوعین کے مقرر کئے ہوئے منہاج استدلال اور فقہی اصول
وقواعد کو بنیاد بنا کر ہر عہد میں پیدا ہونے والے نئے مسائل واحکام کا حل پیش کیا
گیا اور یہ سب اس فقہ کا حصہ بنتا گیا، اس طرح ان مکاتب فقہ نے ایک مربوط اور
مربوط زندگی کے تمام مسائل کو جامع اور محیط مجموعۂ ہائے قوانین کو وجود بخشا جو قرآن
وحدیث، صحابہ کے آثار اور دین کے اصول وقواعد کا عطر اور نچوڑ ہیں اور پورے استناد
کے ساتھ ہم تک پہنچے ہیں، فطری بات ہے کہ تقلیدِ شخصی انہیں فقہاء کی ممکن ہے، اس
لئے تقلیدِ شخصی کا ائمہ اربعہ میں منحصر اور محدود ہونا اور عام مسلمانوں میں اس کا مقبول

ہونا اللہ ہی کی طرف سے ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے بخاری ومسلم یا صحاحِ ستہ کے مجموعہ
ہائے حدیث کی مقبولیت اور اس پر عوام وخواص کا اعتبار واعتماد، حالانکہ حدیث کے
کتنے ہی مجموعے مرتب ہوئے کہ آج ان کے نام محض تاریخ کے صفحات میں ہیں اور
انسانی نگاہیں ان کی دید سے بھی محروم ہیں۔

فقہی کتابوں کا استہزاء:

ادھر ایک نیا فتنہ شروع ہوا ہے، فقہی کتابوں پر تمسخر آمیز تبصروں کا، ان کتابوں
سے ایسے مسائل تلاش کر کر کے نکالے جاتے ہیں جو سیاق وسباق سے کاٹ دیئے
جانے کی وجہ سے بادی النظر میں فحش اور نا قابلِ بیان معلوم ہوتے ہیں اور ان کو جمع
کر کے عام مسلمانوں کو یہ تأثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ مقلدین کی فقہ میں اور
خاص کر احناف کی فقہ میں یہی سب کچھ ہوتا ہے، اس سلسلہ کو مولانا محمد یوسف جے
پوری نے ''حقیقۃ الفقہ'' لکھ کر شروع کیا، دروغ گوئی اور علمی خیانت بھی اگر کوئی ایسی
بات ہوتی جس پر انعام دیا جائے تو شاید مولانا جے پوری سے بڑھ کر انعام کا کوئی
مستحق نہیں ہوتا، یہ کتاب دھوکہ دہی اور اچھائی میں سے برائی اور صاف ستھری جگہ
سے گندگی کی تلاش کا اعلیٰ نمونہ ہے، اب ادھر سنا ہے کہ ہدایہ اور عالمگیری پر بھی اس قسم
کی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

یہ بجائے خود ایک گمراہی ہے!............فقہ کا موضوع انسانی زندگی کے مسائل کا
حل ہے، انسان اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی، انسانی سماج میں اچھے واقعات
بھی رونما ہوتے ہیں اور برے بھی، فقیہ کا کام ہے کہ وہ ہر طرح کے مسائل کو حل
کرے، اس لئے فقہ کی کوئی بھی کتاب ہو، خواہ فقہِ حنفی کی یا کسی اور فقہ کی یا خود غیر
مقلدین کی، اس میں بعض ایسے مسائل کا آنا ناگزیر ہے کہ عام حالات میں ان کا
تذکرہ فحش محسوس ہوگا، یہ ان کتابوں کا نقص نہیں بلکہ کمال ہے کہ وہ ہر طرح کے امکانی

واقعات وحالات کا احاطہ کرتی ہیں، حضرت سلمان فارسی r پر ایک یہودی
نے طنز کیا کہ تمہارے پیغمبر تو پیشاب پاخانہ کا طریقہ بھی بتاتے ہیں، حضرت سلمان
فارسی r اس طنز پر نہ لجائے نہ شرمائے، بلکہ فرمایا: بے شک ہمارے نبی
s نے ہمیں ہدایت دی۔

کتبِ فقہیہ پر جو اعتراض غیر مقلد حضرات کرتے ہیں، وہ دراصل اسی نوعیت کا
ہے............ان اہلِ علم ہی کی کتب کو یکجا کی جائے جن سے غیر مقلد حضرات ہم آہنگی
رکھتے ہیں، جیسے ابن حزم، ابن قیم اور شوکانی وغیرہ، ایسے بیسیوں مسائل مل جائیں
گے، مرد عورت کے صنفی تعلقات پر جس تفصیل سے ابن قیم نے روشنی ڈالی ہے، بہت
کم کتابوں میں ایسی تفصیل مل پائے گی، ادھر بعض علماءِ احناف نے بھی غیر مقلد
مصنفین نواب صدیق حسن خاں اور مولانا وحید الزماں حیدرآبادی وغیرہ کی کتابوں
سے اسی طرح کی فقہی جزئیات کو جمع کیا ہے جو بظاہران مسائل سے بھی زیادہ فحش ہیں
جو ہمارے غیر مقلد بھائیوں نے فقہ وفتاویٰ کی بعض کتابوں سے نقل کئے ہیں............
لیکن راقم الحروف اس طرح کے عمل کو بہرحال ناپسند کرتا ہے، خواہ یہ عمل کسی بھی فریق
کی طرف سے بھی ہو، کیوں کہ اس طرح کا عمل سادہ ذہن لوگوں کو خود اسلام سے
برگشتہ کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اگر خود قرآنِ مجید کی ان آیات کو جمع کیا جائے جن میں مرد
وعورت کے صنفی تعلقات کا ذکر ہے، یا ان احادیث کو یکجا کردیا جائے جن میں
غسل کے وجوب، جماع کی کیفیت یا اس طرح کے مسائل ہیں تو ان پر بھی قریب
قریب وہی اعتراض ہوسکتا ہے جو ہدایہ و عالمگیری کی عبارت پر ہے، اور ایسی
مثالوں کا جمع کرنا بھی چنداں دشوار نہیں لیکن یہ محض ایک بدخدمتی ہوگی اور اگر ان
سب کو ارون شورے جیسے معاند اسلام کے پاس بھیج دیا جائے تو عام لوگوں کے
سامنے اسلام کی غلط تصویر پیش کرنے کے لئے یہی ایک طاقتور ہتھیار بن جائے

گا، اس لئے اس طرح کے مسائل کا ذکر کرنا اپنے ظرف کی گندگی کا مظاہرہ تو
ہوسکتا ہے، اسلام کی خدمت نہیں ہوسکتی۔

برسبیل تذکرہ نقل کرتا ہوں کہ شہر حیدرآباد کی ایک مسجد میں عرصہ سے خطبۂ
جمعہ سے پہلے کچھ دین کی باتیں کہنے کا راقم الحروف کا معمول ہے، جس میں مختلف
مکتبۂ فکر کے لوگ آتے ہیں اور نماز کے بعد کچھ دیر سوال و جواب کی مجلس بھی
ہوتی ہے، ایک جمعہ کو ایک غیر مقلد بھائی آئے اور برسرِ مجلس ہی بڑے فاتحانہ
انداز انداز میں دریافت کرنے لگے کہ مولانا اشرف علی تھانوی کی ''بہشتی زیور''
کیسی کتاب ہے؟ میں نے عرض کیا کہ پوری کتاب تو پڑھنے کا موقع نہیں ملا لیکن
جہاں کہیں میں نے دیکھا ہے مضامین نافع بھی ہیں اور مستند بھی اور جو کچھ نہیں
دیکھا ہے اس کے مستند ومعتبر ہونے کے لئے مصنف کا نام ہی کافی ہے!............
تمسخر آمیز انداز میں کہنے لگے کہ آپ کے تھانوی صاحب نے لکھا ہے کہ اگر کوئی
پاخانہ چاٹ جائے تو جگہ پاک ہوجائے گی؟ میں نے عرض کیا شاید آپ نے
اس کا مطلب یہ سمجھا کہ ہم آپ اس کے مخاطب ہیں............اس کا مقصد یہ بھی
تو ہوسکتا ہے کہ بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ انگلیوں میں پاخانہ بھی لگا لیتے ہیں اور
بے شعوری کی وجہ سے انگلیاں بھی چوستے رہتے ہیں، اگر کسی بچہ کی انگلی میں
پاخانہ لگ جائے پھر وہ اسے منہ میں ڈال لے، بعد میں آپ کے کپڑے یا ہاتھ کو
پکڑ لے تو اب کپڑے یا ہاتھ کا دھونا ضروری نہ ہوگا بے چارے خفیف ہوئے،
پھر میں نے ان سے معذرت کی کہ دل آزاری خدانخواستہ مقصود نہیں، مقصود
صرف آپ کو یہ بتانا ہے کہ کسی بات کو صحیح محل اور صحیح موقعہ پر رکھ کر معنی متعین کرنا
چاہئے اگر بے موقع اور بے محل اللہ اور اس کے رسول s کا کلام رکھ دیا جائے
تو اس سے بھی غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے اور بہت سے بددین اور ملحد لوگ ایسا کرتے
بھی ہیں۔ اعاذنااللّٰہ منہ.

[]

امام ابوحنیفہ ا
محدثین اور سلف صالحین کی نظر میں

حدیث میں آیا ہے کہ اگر ایمان ثریا پر پہنچ جائے جب بھی فرزندانِ فارس میں سے کچھ لوگ اس کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے **لو کان الایمان عند الثریا لنا ولہ رجال من فارس.**

حافظ جلال الدین سیوطی اور حافظ ابن حجر مکی نے اس حدیث کا مصداق امام ابوحنیفہ کو قرار دیا ہے ائمہ متبوعین اور صحاحِ ستہ کے مؤلفین میں امام ابوحنیفہ ہی ہیں جن کو تابعین میں ہونے کا شرف حاصل ہے جن کے لئے حضور s نے مژدۂ مسرت سنایا ہے نیز آنحضور s نے ان لوگوں کو بحیثیتِ مجموعی بہتر قرار دیا جو آپ s کی صدی یعنی پہلی صدی میں پیدا ہوئے ہوں اور ان فقہاء و محدثین میں امام ابو حنیفہ ا ہی ہیں جو اس سعادت سے بہرہ مند ہوئے۔

; امام ابوحنیفہ ا اپنے زمانے کے بڑے فقیہ بھی تھے اور بلند پایہ محدث بھی۔ سننِ ابوداؤد کے مرتب امام ابوداؤد سجستانی نے اپنے ایک قول میں امام مالک ا اور امام شافعی ا کے ساتھ امام ابوحنیفہ ا کی شانِ امامت کا اس طرح اعتراف کیا ہے، فرماتے ہیں:

بخاری ۲/ ۷۲۷، کتاب التفسیر، باب قولہ "وآخرین منھم لما یلحقوا بھم"۔

دیکھئے: تبییض الصحیفة ۳۲۔ الخیرات الحسان ٤٤۔

رحم اللہ ابا حنیفة کان امامًا.

ترجمہ: اللہ تعالیٰ امام ابوحنیفہ ا کے ساتھ رحمت کا معاملہ فرمائے وہ واقعی امام تھے۔

; وکیع بڑے بلند پایہ محدث ہیں، یحییٰ بن معین کا بیان ہے کہ وہ امام ابوحنیفہ ا کی رائے پر فتویٰ دیتے تھے۔ ان کو امام ابوحنیفہ ا کی تمام روایتیں ازبر تھیں اور انہوں نے بکثرت امام عالی مقام سے حدیثیں سن رکھی تھیں۔

کان یحفظ حدیثه کله و کان قد سمع من ابی حنیفة حدیثًا کثیرًا.

; سفیان ثوری، عبداللہ بن مبارک، حماد بن زید، ھشیم، وکیع، ابن جراح، عباد ابن عوام اور جعفر ابن عون جیسے اساطینِ محدثین نے آپ ا سے علمِ حدیث میں کسبِ فیض کیا ہے۔

; سرخیل محدثین امام مالک کا حال یہ تھا کہ جب آپ کی مجلس درس میں امام ابوحنیفہ ا رونق افروز ہوئے تو ان کو اونچے مقام پر بٹھایا، حالانکہ بڑے بڑے محدثین و فقہاء اس درس گاہ کے طلبہ ہوتے تھے اور امام مالک ا کے وقار و تمکنت سے نظر برابر کرنے کی ہمت نہ پاتے تھے، پھر امام صاحب کے رخصت ہونے کے بعد آپ ا کی ذہانت و ذکاوت اور قوتِ استدلال کی بابت امام مالک ا نے فرمایا: یہ ابوحنیفہ نعمان ہیں اگر وہ اس ستون کے بارے میں کہہ دیں کہ یہ سونے کا ہے تو واقعی یہ سونے کا نکلے، پھر سفیان ثوری آئے تو ان کو

عقود الجواهر المنيفة ۱/ ۱۲۔

عقود الجواهر المنيفة ۱/ ۱۱۔

حوالۂ سابق ۱/ ۱۲۔

امام ابوحنیفہ ا کے مقابلہ کسی قدر نیچے بٹھایا اور جب واپس ہوئے تو ان کے تفقہ اور زہد کا ذکر فرمایا[1]

; امام شافعی ا فرمایا کرتے تھے کہ لوگ فقہ میں امام ابوحنیفہ ا کی عیال ہیں، یہ بھی فرماتے کہ میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو امام ابوحنیفہ سے زیادہ فقیہ ہو اور یہ بھی کہ جس نے امام ابوحنیفہ کی کتابیں نہیں دیکھیں وہ علم میں تبحر اور تفقہ حاصل نہیں کرسکتا [2] اور ظاہر ہے کہ فقیہ کے لئے محدث ہونا بھی ضروری ہے کیوں کہ حدیث ہی شریعتِ اسلامی کا سب سے بڑا ماٴخذ ہے اور حدیث پر گہری نگاہ کے بغیر نہ احکام کا استنباط کیا جاسکتا ہے اور نہ اس کے بغیر کوئی شخص فقیہ کہلاسکتا ہے۔

; امام احمد ا فرماتے تھے کہ امام ابوحنیفہ ا اصحابِ ورع اور اصحابِ زہد میں سے ہیں اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے میں ان کا جو مقام ہے اس میں کوئی ان کا ہمسر نہیں **انہ من اھل الورع والزھد وایثار الآخرۃ بمحل لایدرکہ احد.** [3]

; امام عبداللہ ابن مبارک ا امام ابوحنیفہ ا کے خاص مداحوں میں تھے فرمایا کرتے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے امام ابوحنیفہ اور سفیان ثوری کے ذریعہ میری مدد نہ کی ہوتی یعنی ان سے استفادہ کا موقع میسر نہ آیا ہوتا تو میں ایک عام آدمی کی طرح ہوتا [4] کبھی کہتے اگر اللہ نے مجھے ان دونوں سے نہ ملایا ہوتا تو میں بدعتی ہوتا۔ [5]

[1] الخیرات الحسان: ٤٤۔
[2] حوالۂ سابق۔
[3] الخیرات الحسان: ٤٦۔
[4] تبییض الصحیفۃ / ١٠٣۔
[5] مناقب الامام ابوحنیفۃ للذھبی/ ١٨۔

; مکی ابن ابراہیم امام بخاری کے ان اساتذہ میں ہیں جن سے بخاری کی اکثر ثلاثی روایات منقول ہیں، وہ فرمایا کرتے تھے کہ امام ابوحنیفہ ا اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم ہیں، کان ابوحنیفۃ اعلم اہل زمانہ [1]

; شعبہ بن حجاج جن کو امیر المؤمنین فی الحدیث کہا جاتا تھا، امام ابوحنیفہ ا کو خط لکھا کرتے تھے کہ وہ حدیثیں بیان کریں نیز امام ابوحنیفہ ا کی شان میں اشعار پڑھا کرتے تھے [2] انہیں کا بیان ہے کہ امام ابو حنیفہ ا بہت اعلیٰ فہم کے مالک اور قوی الحفظ شخص ہیں، اسی لئے شعبہ کا معمول تھا کہ آپ کے لئے کثرت سے دعاء رحمت فرماتے۔ [3]

; مشہور محدث اور فقیہ سفیان ثوری ا امام ابوحنیفہ ا کے بڑے معترف تھے ایک صاحب امام ابوحنیفہ ا کے پاس سے سفیان کے پاس آئے تو سفیان نے کہا کہ تم ایک ایسے شخص کے پاس آئے ہو جو روئے ارض کا سب سے بڑا فقیہ ہے، **لقد جئت من افقہ اھل الارض**، ایک بار امام ابوحنیفہ ا اور سفیان ثوری کا ایک ساتھ سفر ہوا تو سفیان از راہ احترام ان کے پیچھے چلتے اور کوئی سوال کرتا تو جواب دینے سے گریز کرتے یہاں تک کہ امام صاحب جواب عنایت فرماتے۔ [4]

; اسی لئے امام ابو یوسف ا فرمایا کرتے کہ سفیان مجھ سے زیادہ امام ابوحنیفہ ا کی متابعت کرتے تھے۔ [5]

; سفیان ابن عینیہ بھی امام ابوحنیفہ ا کی مروت اور اہتمام نماز

[1] الخیرات الحسان: ٤٧۔
[2] الانتقاء: ١٢٦۔
[3] الخیرات الحسان: ٤٨۔
[4] الخیرات الحسان: ٤٥۔
[5] الانتقاء: ١٢٨۔

کے بڑے معترف تھے اور یہ بھی فرماتے تھے کہ مجھے سب سے پہلے انہوں نے ہی کوفہ میں طلب حدیث کیلئے بٹھایا، اول من اقعدنی للحدیث ابو حنیفة.[1]

; یہ بھی کہتے کہ میری ان آنکھوں نے امام ابوحنیفہ l کی نظیر نہیں دیکھی، ماتعلت عینی مثل ابی حنیفة.[2]

; اور یہ بھی کہ ''عالم'' حضرت عبداللہ ابن عباس r کے عہد میں عبداللہ ابن عباس r، شعبی کے عہد میں شعبی امام ابوحنیفہ l اور سفیان ثوری l کے عہد میں سفیان ثوری l تھے۔[3]

; یحییٰ بن معین جیسے بلند پایہ اور ناقد چار ہی شخص کے تفقہ کے قائل تھے اور ان میں بھی سرفہرست امام ابوحنیفہ l کا نام رکھتے تھے، پھر سفیان ثوری l، امام مالک l اور اوزاعی l کے نام لیتے، یہ بھی فرماتے کہ قراءت میں حمزہ اور فقہ میں امام ابوحنیفہ l کا جواب نہیں، الفقه فقه ابی حنیفه [4] یحییٰ ابن معین سے دریافت کیا گیا کہ امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام ابو یوسف M میں کون آپ کو زیادہ محبوب ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ امام ابوحنیفہ جن سے بہت سے صالح لوگوں نے روایت کیا ہے، امام شافعی کی حدیث میں پسند نہیں کرتا، [5] اور امام ابو یوسف گو سچے اور معتبر راوی ہیں، لیکن ان کی حدیث کافی نہیں۔[6]

[1] الاتقاء: ۱۲۸۔ ۳۰۔

[2] مناقب الامام ابو حنیفة للمذهبی: ۲۷۔

[3] حوالۂ سابق: ۱۹۔

[4] الخیرات الحسان: ۴۸۔

[5] (ویسے یحییٰ بن معین کی یہ بات اہل علم وتحقیق کے نزدیک مقبول نہیں، کیوں کہ امام شافعی l نہایت جلیل القدر محدث، فقیہ، مفسر اور زبان وادب شناس تھے)۔

[6] عقود الجواهر المنیفه ۱/ ۱۲۔

; امام ابوبکر اعمش فرماتے تھے کہ امام ابوحنیفہ کے علم میں برکت عطاء فرمائی گئی ہے، جب کوئی اہم مسئلہ دریافت کیا جاتا تو فرماتے: یہ اور اس طرح کے مسائل کا بہتر جواب امام ابوحنیفہ ہی دے سکتے ہیں، جب حج کا ارادہ ہوا تو باضابطہ علی ابن مسہر کو امام ابوحنیفہ l کی خدمت میں بھیجا کہ آپ کے لئے مسائلِ حج تحریر فرمادیں۔[1]

; یحییٰ ابن سعید القطان جیسے محدث اور فن رجال کے بلند پایہ ناقد فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے امام ابوحنیفہ سے بہتر کسی کی رائے نہیں دیکھی، چنانچہ وہ امام ابوحنیفہ l ہی کے قول پر فتاویٰ دیا کرتے تھے۔[2]

; امام وکیع سے منقول ہے کہ امام ابوحنیفہ l نہایت امانت دار تھے، ان کے قلب میں اللہ تعالیٰ کی جلالت وعظمت اور کبریائی سمائی ہوئی تھی اور وہ ہر چیز پر اللہ کی خوشنودی کو ترجیح دیتے تھے، اگر ان پر تلوار بھی رکھ دی جاتی جب بھی وہ اسے برداشت کرتے، وہ واقعی ابرار میں سے تھے، [3] وکیع امام ابوحنیفہ l کے تقویٰ اور للّٰہیت ہی کے معترف نہیں تھے بلکہ علم واجتہاد میں بھی آپ کے قدر شناس تھے اور آپ ہی کے قول پر فتویٰ دیتے تھے چنانچہ یحییٰ ابن معین کا بیان ہے: کان یفتی برأی ابی حنیفة.[4]

; حماد ابن زید جیسے محدث کے بارے میں سلیمان بن حرب نے نقل کیا ہے کہ انہوں نے امام ابوحنیفہ سے بہت ساری حدیثیں روایت کی ہیں روی حماد بن زید عن ابی حنیفة احادیث کثیرة.[5]

[1] الانتقاء: ۱۲۶۔ الخیرات الحسان: ۴۸۔

[2] الخیرات الحسان: ۴۷۔

[3] تبییض الصحیفة: ۱۰۹۔

[4] الانتقاء: ۱۲۶۔

[5] الانتقاء: ۱۳۰۔

; سعید بن ابی اردیہ فرمایا کرتے تھے کہ امام ابوحنیفہ ا عراق کے
سب سے بڑے عالم ہیں۔

; خلف ابن ایوب جن کا شمار بڑے محدثین میں ہے، کہا کرتے تھے کہ اللہ
تعالیٰ سے علم حضور s تک پہنچا، حضور s سے صحابہ تک، صحابہ سے تابعین تک
اور تابعین سے امام ابوحنیفہ ا اور ان کے رفقاء تک۔

; سرخیل محدثین معمر ا سے منقول ہے کہ میں کسی شخص کو نہیں جانتا
جو امام ابوحنیفہ سے بڑھ کر فقہ پر گفتگو کرسکتا ہو، قیاس کی صلاحیت رکھتا ہو اور حدیث کی
تشریح و توضیح کی صلاحیت کا حامل ہو۔

; مسعر بن کدام بلند پایہ رواتِ حدیث میں ہیں، وہ فرماتے تھے کہ جس نے
اپنے درمیان اور خدا کے درمیان امام ابوحنیفہ ا کو رکھا (یعنی امام ابوحنیفہ
ا کی تشریح دین پر عمل کیا) تو امید ہے کہ اس کے لئے خوف کی بات نہ
ہوگی اور وہ اپنے ساتھ احتیاط کے معاملہ میں کوتاہی کرنے والا تصور نہ کیا جائے گا، یہ
بھی کہتے کہ میں نے امام ابوحنیفہ ا سے بڑا فقیہ نہیں دیکھا نیز ابن مبارک
ناقل ہیں کہ میں نے مسعر کو امام ابوحنیفہ کی مجلس میں دیکھا کہ آپ سے سوال کرتے اور
استفادہ کرتے۔

; قاسم ابن معین کو لوگوں نے طعنہ دیا کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود
r کے مصاحبین میں سے ہونے کے باوجود امام ابوحنیفہ ا کی
مجلسوں میں بیٹھتے ہیں تو قاسم ابن معن نے کہا کہ امام ابوحنیفہ ا کی مجلس

الانتقاء: ١٣٠۔
تبییض الصحیفة: ١٠٨۔
حوالہ سابق: ١١٠۔
الخیرات الحسان: ٤٧۔

سے بڑھ کر نافع کوئی مجلس نہیں جس میں لوگ بیٹھے ہوں۔

; عبدالرزاق ابن ہمام جن کی مصنف حدیث کا وسیع ترین ذخیرہ ہے، فرماتے
ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہ ا سے بڑھ کر حلیم و بردبار نہیں دیکھا نیز اپنا
تجربہ نقل کیا ہے کہ ہم نے آپ ا کو حضرت عبداللہ بن مسعود r
کی طرف جو بات بھی منسوب کرتے ہوئے سنا مبنی بہ صواب پایا۔

; ابن شبرمہ جن کا شمار معروف فقہاء میں ہے فرمایا کرتے کہ عورتیں اس بات
سے عاجز ہیں کہ امام ابوحنیفہ ا جیسے شخص کو جنم دیں۔

; قاضی شریک نخعی ا بھی آپ ا کے بڑے معترف تھے۔

; خارجہ بن معصب ا کہا کرتے تھے کہ فقہاء میں امام ابوحنیفہ
ا کی مثال اس کھونٹے کی ہے جس پر چکی گردش کرتی ہے اور اس ماہر
صراف کی سی ہے جو سونے کی پرکھ رکھتا ہے۔

; یزید بن ہارون ا جیسی محدث اور زاھد ہستی کا بیان ہے کہ میں
نے امام ابوحنیفہ ا سے بڑھ کر صاحب عقل، صاحب فضل اور صاحب ورع
نہیں دیکھا مارأیت احدا اعقل و لا افضل و لا اورع من ابی حنیفة.

; فضیل بن عیاض ا جن کا شمار زھادِ امت میں ہے، آپ کے
اوصاف کو بڑی فراخی دلی سے بیان کرتے، چنانچہ ان کا بیان ہے کہ آپ فقیہ تھے، اور
تفقہ میں معروف، زہد و ورع میں مشہور، صاحب مروت اور ہر آنے والے پر اپنے فضل

الانتقاء: ١٣٤۔
الانتقاء: ١٣٥۔
الانتقاء: ١٣١۔
حوالۂ سابق۔
الخیرات الحسان: ٤٩۔
تبییض الصحیفة: ١٠٧۔

کا دروازہ کھلا رکھنے، شب وروز علم کے حصول پر صابر، کم گو، حلال وحرام کے کسی بھی
مسئلہ کا حق کے مطابق ہی جواب دیتے اور ارباب حکومت سے دور دور ہی رہتے۔

; مشہور محدث زہیر ابن معاویہ آپ سے اس قدر متأثر تھے کہ برملا فرماتے
تھے امام ابوحنیفہ ا کے درس میں ایک دن حاضری میرے پاس ایک مہینے
کی حاضری سے زیادہ نفع بخش ہے۔

; عبداللہ ابن داؤد خریبی فرمایا کرتے تھے کہ مسلمانوں پر اپنی نمازوں میں امام
ابوحنیفہ ا کے لئے دعا کرنا واجب ہے اور امام ابوحنیفہ ا کی
حدیث وفقہ پر محافظت کا ذکر فرماتے۔

; شداد ابن حکیم کہا کرتے کہ میں نے امام ابوحنیفہ ا سے بڑا
صاحب علم نہیں دیکھا۔

; حسن ابن سلیمان کا خیال تھا کہ حدیث نبوی s ''قیامت قائم نہ ہوگی
جب تک کہ علم ظاہر نہ ہوجائے'' **لاتکون الساعة حتی یظهر العلم**'' میں علم
سے امام ابوحنیفہ ا کا علم اور تشریح حدیث مراد ہے۔

; امام اوزاعی کہا کرتے تھے کہ مشکل مسائل پر سب سے زیادہ امام ابوحنیفہ
ا آگاہ تھے۔

; علی بن عاصم کہا کرتے تھے کہ اگر امام ابوحنیفہ ا کو روئے زمین
پر رہنے والے آدھے لوگوں کی عقل سے تولا جائے تو امام ابوحنیفہ ا کی

الخیرات الحسان: ٤٧۔
الانتقاء: ١٢٤۔
تبییض الصحیفة: ١٠٤۔
حوالۂ سابق۔
تبییض الصحیفة: ١٠٩۔
حوالۂ سابق۔ ١١٢۔

عقل بڑھ جائے گی۔

; امام ابو یوسف فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنے والدین سے پہلے امام ابو
حنیفہ ا کے لئے دعا کرتا ہوں۔

; حافظ محمد ابن میمون فرماتے تھے کہ امام ابوحنیفہ ا کے زمانے
میں آپ سے بڑا عالم، صاحب ورع، صاحب زہد صاحب معرفت اور فقیہ کوئی
شخص نہیں تھا۔

; مشہور محدث سعد بن کدام کہتے تھے کہ اللہ امام ابوحنیفہ پر رحم فرمائے، وہ
بڑے فقیہ اور صاحب علم تھے۔

; ایوب سختیانی کو جب معلوم ہوا کہ امام ہمام حج میں تشریف لا رہے ہیں تو
حماد ابن زید کے ذریعہ آپ کو سلام بھیجنے کا شرف حاصل کیا۔

; مشہور فقیہ اور محدث ابن جریج امام صاحب کی حیثیت سے بڑھ کر متأثر
تھے، جب آپ کی وفات کی اطلاع ملی تو فرمایا کہ آپ ا کے ساتھ
بہت سارا علم جاتا رہا۔

; عیسیٰ ابن یونس تنبیہ کرتے کہ امام ابوحنیفہ ا کی شان میں بد
گوئی نہ کرو اور نہ بدگوئی کرنے والوں کی تصدیق کرو، خدا کی قسم! میں نے آپ سے
بہتر، آپ سے زیادہ محتاط، آپ سے بڑھ کر فقیہ کسی اور کو نہیں پایا۔

; معروف محدث حماد سلمہ نے آپ ا کو سب سے بلند پایہ

تبییض الصحیفة: ١١٣۔
الخیرات الحسان: ٤٨۔
حوالۂ سابق: ٤٩۔
الانتقاء: ١٢٥۔
بحوالۂ سابق۔
الانتقاء: ١٣٥۔
الانتقاء: ١٣٧۔

مفتی قرار دیا۔

; محدث حسن ابن صالح کا بیان ہے کہ امام ابوحنیفہ ا فہیم، صاحب علم اور عمیق علم کے حامل شخص تھے جب ان کے نزدیک حضور s کی کوئی حدیث درجۂ صحت کو پہنچ جاتی تو آپ ا کسی اور طرف رجوع نہیں کرتے۔

; اسد ابن عمرو کا بیان ہے کہ رات کے وقت امام ابوحنیفہ ا کا گریہ زاری ایسا ہوتا تھا کہ آپ ا کے پڑوسیوں کو بھی ترس آتا تھا۔

; مشہور محدث بکیر ابن معروف کہا کرتے تھے کہ میں نے امتِ محمدیہ میں امام ابوحنیفہ ا سے بہتر طور طریق کا کوئی آدمی نہیں دیکھا **مارأیت رجلا احسن سیرة فی امة محمد من ابی حنیفة.**

; حسن ابن عمارہ جو مشہور رواتِ حدیث میں ہیں، کے بارے میں امام عبداللہ ابن مبارک ناقل ہیں کہ میں نے دیکھا وہ امام ابوحنیفہ کی سواری کی رکاب تھامے ہوئے ہیں اور کہتے جاتے ہیں: بخدا! ہم نے فقہ میں آپ سے زیادہ بہتر کلام کرنے اور مختصر جواب دینے والا نہیں پایا، حقیقت یہ ہے کہ آپ فقہ پر کلام کرنے والوں کے سردار ہیں، آپ کے زمانے میں کوئی آپ کا مقابل نہیں اور جو لوگ آپ کے منہ آتے ہیں وہ محض حسد کا شکار ہیں، **وما یتکلمون فیک الا حسدًا.**

; فن اسماء الرجال کے امام حافظ ذہبی نے آپ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

تبییض الصحیفة: ۱۱۰۔

۲۔ الانتقاء: ۱۲۸۔

۳۔ الخیرات الحسان: ۵۳۔

۴۔ حوالہٗ سابق: ۵٦۔

۵۔ تبییض الصحیفه: ۱۱۰۔

ابو حنیفة الامام الاعظم فقیه العراق وکان اماما ورعا، عالما عاملا متعبد اکبیر الشان.

ترجمہ: امام ابوحنیفہ امام اعظم اور عراق کے فقیہ ہیں، وہ امام زاہد و متورع، عالم باعمل، عبادت گذار اور بڑی شان کے حامل تھے۔

; مشہور مؤرخ ابن خلکان اپنی تاریخ میں رقمطراز ہے:

کان ابو حنیفة عالمًا عاملاً زاهدًا ورعًا تقیًا کثیر الخشوع واتم التضرع الی اللّٰه تعالٰی.

ترجمہ: امام ابوحنیفہ صاحب علم، باعمل زاہد و متورع، تقوی بہت خشوع رکھنے والے اور اللہ تعالیٰ سے بہت گریہ وزاری کرنے والے تھے۔

; حافظ ابن کثیر ان الفاظ میں آپ ا کا ذکر گرامی کرتے ہیں:

الامام فقیه العراق احد ائمة الاسلام والسادة الاعلام احد ارکان العلماء احد الائمة الاربعة اصحاب المذاهب المتبوعة.

ترجمہ: امام فقیہ عراق ہیں، ائمہ اسلام اور عظیم شخصیتوں میں سے ایک ہیں، اساطین علماء میں سے ایک، ائمہ اربعہ (جن کے طریق فقہ کی پیروی کی جاتی ہے) میں سے ایک ہیں۔

آپ ا کے معاصرین تو آپ ا کی شخصیت کے بارے میں رطب اللسان ہیں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ آپ کے بعد کے بعض مؤلفین کی طرف

تذکرة الحفاظ: ۱٦۸/۱۔

تبییض الصحیفه: ۱۱۲۔

البدایة والنهایة: ۱۰۔۱۰۷۔

سے بعض ایسی باتیں بھی منسوب ہیں جو آپ کی ذات والا صفات کو مجروح کرتی ہیں، لیکن یہ کچھ عجیب نہیں، تاریخ میں ہر ذہین اور اپنے عہد کی عبقری شخصیت ایسے عناد کا ہدف ہے، حافظ ابن عبدالبر کا بیان ہے:

یستبدل علٰی نباھة الرجل من الماضین بتباین الناس فیه قالوا الاتریٰ الٰی علی ابن ابی طالب انه قد ھلک فیه فئتان محب مفرط ومبغض مفرط وھذه صفة اھل النباھة ومن بلغ فی الدین والفضل الغایة.

ترجمہ: گذرے ہوئے لوگوں میں سے کسی کی ذہانت اور عروج ومقام پر اس بات سے بھی استدلال کیا جاتا ہے کہ اس کے بارے میں لوگوں کی رائے مختلف ہو، اہل علم کہتے ہیں کہ حضرت علی r کے معمول کو دیکھو کہ ان کی بابت دو گروہ ہلاک ہوئے، ایک وہ لوگ جنہوں نے محبت میں غلو سے کام لیا اور دوسرے وہ جنہوں نے بغض وکدورت مس افراط کا راستہ اختیار کیا، یہ بھی ان حضرات کی صفت ہے جو ذہین ہیں اور دین اور فضل کے اعتبار سے بلند مقام پر پہنچے ہوئے ہیں۔

حضرت الامام الہمام کے بارے میں بھی یہی صورتحال درپیش ہے۔ اگر بہ نظر تحقیق دیکھا جائے تو اس کے دو (۲) اسباب ہیں: حداور غلط فہمی............حسد واقعی بڑی بلا ہے اور اچھے اچھوں اور بڑے بڑوں کو گرفتار کر لیتی ہے۔

فضل بن موسیٰ سے ان لوگوں کی بابت دریافت کیا گیا جو امام ابوحنیفہ کی مخالفت پر کمر بستہ تھے، آپ ا نے فرمایا:

ان ابا حنیفة جاء ھم بما یعقلونه وبمالا یعقلونه من العلم ولم یترک لھم شیئًا فحسدوه.

عقودالجواھر المنیفه: ۱۵/۱۔

الانتقاء: ۱۳٦۔

ترجمہ: امام ابوحنیفہ ان کے پاس ایسے علوم کے ساتھ آئے کہ کچھ یہ سمجھ پاتے تھے اور کچھ ان کے فہم نارسا سے ماوراء تھے اور ان کیلئے کچھ نہ چھوڑا اس لئے لوگوں کو آپ سے حسد ہو گیا۔

الفاظ کے تھوڑے فرق کے ساتھ اسی طرح کی بات یحییٰ ابن آدم سے بھی منقول ہے:

الناس فی ابی حنیفة حاسد وجاھل واحسنھم عندی حال الجاھل.

ترجمہ: امام ابوحنیفہ کے بارے میں بعض لوگ حاسد ہیں اور بعض ناواقف اور میرے نزدیک ناواقف کا معاملہ کمتر ہے۔

حسن بن عمارہ نے خود امام صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

وما یتکلمون فیک الا حسدًا.

ترجمہ: لوگ آپ کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں وہ محض حسد کا نتیجہ ہے۔

عیسیٰ ابن یونس کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص امام ابوحنیفہ کی مخالفت کرتا ہو تو اس کو سچا نہ جانو:

لاتصدقن احدا یسئی القول فیه فانی واللّٰه ما رأیت افضل منه ولا افقه منه.

ترجمہ: امام ابوحنیفہ کے بارے میں کوئی بدگوئی کرے تو اس کو سچا نہ جانو، واللہ میں نے آپ ا سے افضل اور آپ سے بڑھ کر فقیہ نہیں دیکھا۔

الخیرات الحسان: ٤٨۔

تبییض الصحیفة: ١٠٨۔

حوالۂ سابق: ١١٠۔

الخیرات الحسان: ٤٧۔

ابوسلیمان نے بہت درست کہا ہے جو بے چارے عقل رسا سے محروم ہیں وہی امام ابوحنیفہ کے کلام سے بیزار ہیں:

کان ابو حنیفة عجبا من العجب وانما یرغب عن کلامه من لم یقو علیه.

ترجمہ: امام ابوحنیفہ ایک نادرۂ روزگار شخصیت تھے اور ان کی بات سے وہی بے رغبتی اختیار کرتا ہے جو خود اس کے سمجھنے پر قادر نہ ہو۔

حسد کے باب میں "نام" سے دھوکا نہ کھانا چاہئے، غور کرو اس حسد نے کسی کو چھوڑا ہے؟ کیا امام ابوحنیفہ و مالک اور کیا امام شافعی و احمد، اور کیا بخاری ونسائی اور ابن تیمیہ، اور پھر ان پر زبان کھولنے والے بھی کیسے کیسے اساطین اور اقلیم علم وفن کے سلاطین ہیں............؟

دوسرا سبب غلط فہمی وناواقفیت ہے، ابن ابی داؤد کا اعتراف حقیقت گذر چکا ہے کہ امام صاحب پر زبان کھولنے والے یا تو حاسدین ہیں یا جاہلین و ناواقف، اسد بن حکیم کا بیان ہے:

لایقع فیه الاجاهل او مبتدع.

ترجمہ: امام ابوحنیفہ کی ناواقف یا بدعتی ہی عیب جوئی کرسکتا ہے۔

غلط فہمی اور ناواقفیت اکثر اچھے اچھے لوگوں کے چشمۂ دل کو بھی مکدر کردیتی۔ اس لئے کہ انسان خواہ کتنا ہی بڑا صاحب علم کیوں نہ ہو وہ بہرحال عالم الغیب نہیں اور حقائق سے اس کا باخبر ہونا ضروری نہیں، خاص کر جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ احترام واعزاز

الخیرات الحسان: ۴۹۔

حوالۂ سابق۔

کا مقام عطاء فرماتا ہے، اس کے حاسدین کی تعداد بھی بڑھ جاتی ہے، مثلاً امام بخاری اور علامہ ابن تیمیہ کو دیکھا جائے کہ ان کے بارے میں کیا کچھ غلط فہمیاں نہیں پھیلائی گئیں، شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی مرحوم ماضی قریب کے مصلحین میں ہیں، ان کے بارے میں کتنا کچھ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ آج بھی برصغیر میں مسلمانوں کی بڑی تعداد ان کے بارے میں غلط فہمیوں کا شکار ہیں حالاں کہ آج پریس اور ذرائع ابلاغ کی ترقی کا دور ہے اور کسی غلط فہمی کا ازالہ نسبتاً آسان ہے، امام ابوحنیفہ کا زمانہ تو بہرحال ایسی سہولتوں اور آسانیوں سے خالی وعاری تھا، اس لئے اس دور میں غلط فہمیوں کا پھیلنا اور بروقت اس کا ازالہ نہ ہو پانا مستبعد نہیں۔

چنانچہ متعدد واقعات ہیں جن سے اس کا اندازہ ہوتا ہے، مثلاً فقیہ شام امام اوزاعی بھی ان لوگوں میں تھے جو امام ابوحنیفہ کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے، انہوں نے ابن مبارک سے پوچھا یہ کون بدعتی ہے جو کوفہ میں ظاہر ہوا ہے اور ابوحنیفہ کہلاتا ہے؟ عبداللہ ابن مبارک نے فوری جواب دینے کے بجائے کچھ مشکل مسائل جو تحریری شکل میں تھے ان کے حوالہ کئے، اس تحریر پر مؤلف کی حیثیت سے "نعمان بن ثابت" کا نام تھا، اوزاعی اس تحریر سے بہت متأثر ہوئے اور دریافت کیا یہ کون بزرگ ہیں؟ عبداللہ بن مبارک نے کہا: یہ عراق کے ایک شیخ ہیں جن سے میری ملاقات ہوئی ہے۔ اوزاعی نے کہا یہ نہایت بلند پایہ شیخ ہیں، تم ان سے خوب استفادہ کرو، عبداللہ بن مبارک نے کہا یہ وہی امام ابوحنیفہ ہیں جن سے آپ نے منع فرمایا تھا۔ پھر جب ایک دفعہ مکہ مکرمہ میں امام ابوحنیفہ اور اوزاعی کی ملاقات ہوئی تو انہیں مسائل پر گفتگو ہوئی اور اس تحریر سے بھی زیادہ وضاحت وقوت کے ساتھ امام ابوحنیفہ نے ان مسائل کو بیان کیا تو امام صاحب سے امام اوزاعی کی محبت اور بڑھ گئی اور عبداللہ ابن مبارک سے فرمایا کہ مجھے اس شخص کے کثرت علم اور کمال عقل پر

بہت رشک ہے اور میں اللہ سے مغفرت کا طلبگار ہوں، میں ان کے بارے میں کھلی غلط فہمی میں تھا، مجھے ان کے بارے میں جو بات پہنچی تھی، حقیقت اس کے بالکل ہی برخلاف ہے، **فانه بخلاف مابلغني عنه.** 🗀

سفیان ثوری کو بھی امام ابوحنیفہ ا کے بارے میں ابتداءاً بڑی غلط فہمی تھی مگر جب باہمی ملاقات ہوئی اور تبادلہ خیال ہوا تو ساری غلط فہمی دور ہوگئی اور خود احساس ہوا کہ وہ آپ کے بارے میں بڑی غلط فہمی میں مبتلا تھے 🗎 پھر بعد میں ایسے معتقد ہوئے کہ جب امام ابوحنیفہ ا کے ساتھ چلتے تو ازراہ احترام خود پیچھے چلتے اور امام صاحب کو آگے رکھتے اور جب کوئی سوال کرتا تو امام صاحب کے سامنے جواب دینے سے گریز کرتے یہاں تک کہ سفیان ثوری کے بھائی عمر بن سعید کی وفات پر امام ہمام تعزیت کے لئے تشریف لے گئے، سفیان ثوری اپنی مجلس سے اٹھ گئے، کھڑے ہو کر معانقہ کیا، اپنی جگہ آپ کو بیٹھایا اور خود سامنے مؤدبانہ بیٹھ گئے۔ سفیان ثوری کے ایک مصاحب نے عرض کیا کہ امام ابو حنیفہ ا کیلئے اس طرح آپ کا اٹھنا اور احترام سے پیش آنا خود مجھ کو اور آپ کے دوسرے تلامذہ کو ناگوار گذرا ہے؟ سفیان ثوری نے فرمایا، اس میں ناگواری کی کیا بات ہے؟ یہ شخص علم میں بڑے مقام کا حامل ہے پھر اگر علم کی وجہ سے میں ان کا احترام نہ کرتا تو ان کی عمر کی رعایت سے کرتا، اگر عمر کی وجہ سے کھڑے ہو کر استقبال نہ کرتا تو ان کے تفقہ کا لحاظ کرتا، اگر تفقہ کا بھی لحاظ نہ کرتا تو ان کے زہد وتقویٰ کی وجہ سے ان کے لئے کھڑا ہوتا۔ 🗏

امام محمد باقر جو اہل بیت کے علوم کے امین تھے اور اپنے زمانے کے متفق علیہ بلند

🗀 الخیرات الحسان: ۴۹۔

🗎 المیزان الکبریٰ۔

🗏 تبییض الصحیفة: ۱۱۲۔

پایہ محدث اور فقیہ تھے ان کا ذہن بھی ابتداءاً امام صاحب کے بارے میں صاف نہیں تھا لیکن جب آپ سے ملاقات ہوئی تو حقیقت حال واضح ہوئی، آپ نے امام صاحب سے دریافت فرمایا کہ آپ حدیث رسول s پر قیاس ورائے کو ترجیح دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا یہ کیوں کر ممکن ہے؟ پھر پوچھا مرد کمزور ہے یا عورت؟ امام باقر نے فرمایا عورت، امام صاحب نے فرمایا: اگر میں قیاس پر عمل کرتا تو میں میراث میں عورت کا حصہ مرد سے زائد رکھتا پھر امام صاحب نے پوچھا نماز زیادہ افضل عمل ہے یا روزہ؟ امام باقر نے کہا: نماز، آپ ا نے کہا اگر میں قیاس سے کام لیتا تو عورتوں کو حیض سے پاک ہونے کے بعد نماز کی قضاء کا حکم دیتا نہ کہ روزہ کی لیکن چوں کہ آپ کے نانا s کا ارشاد موجود ہے اس لئے روزہ کی قضا واجب ہوگی، نماز کی قضاء نہیں ہوگی! پھر امام صاحب نے دریافت کیا کہ پیشاب زیادہ ناپاک ہے یا مادۂ منویہ؟ امام باقر نے کہا، پیشاب۔ آپ ا نے فرمایا اگر میں قیاس پر عامل ہوتا تو پیشاب کی وجہ سے غسل واجب قرار دیتا لیکن آپ کے نانا جان s کی حدیث کے سبب ہم پیشاب کی وجہ سے صرف وضو واجب قرار دیتے ہیں نہ کہ غسل، یہ سن کر امام باقر اٹھے، آپ ا سے بغلگیر ہوئے، چہرہ کو بوسہ دیا اور بڑی تکریم کا معاملہ فرمایا۔ 🗀

اس لئے حقیقت یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کے بارے میں بڑی غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں، کیوں کہ ایک تو امویوں اور عباسیوں دونوں سے آپ ا کا اختلاف رہا، علویوں سے آپ کی قربت تھی، عراق جو بعض فرق باطلہ کا مرکز بن گیا تھا، ان سے آپ کا اختلاف تھا شیعوں سے بھی آپ کا اختلاف رہا کیوں کہ آپ حضرات شیخین r کو اہل سنت والجماعت کے مسلک کے مطابق سب سے افضل مانتے تھے، کوفہ میں حضرت عثمان غنی r کا نام تک احترام کے ساتھ لینا ایک

🗀 المناقب للموفق:

جرم سے کم نہیں تھا، آپ بابانگ دہل حضرت عثمان r کا ذکر خیر فرماتے، حضرت علی r کو بھی خلیفہ راشد اور برحق جانتے تھے، اس لئے خوارج اور ناصبیہ سے آپ کا اختلاف تھا عباسیوں کے دور میں معتزلہ نامی فرقہ کو سیاسی سطح پر بڑا غلبہ حاصل ہوگیا تھا، ایمان اور قرآن کے بارے میں معتزلہ کے تصورات کا آپ نے ردفرمایا، اہل باطل سے آپ نے بڑے بڑے مناظرے فرمائے، اس لئے یہ سب آپ کے مخالفین تھے، اور عجب نہیں کہ ان ہی حضرات نے آپ ا کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلائی ہوں اور عراق میں اہل سنت والجماعت کی بنیاد کو کمزور کرنے کی غرض سے آپ کے خلاف بدگمانیوں کا ہالہ بنایا ہو، اسی لئے حافظ ابن حجر مکی ا نقل کرتے ہیں:

قال الحافظ عبدالعزيز ابن ابی داؤد من احب ابا حنيفة فهو سنی ومن ابغضه فهو مبتدع وفی رواية بيننا وبين الناس ابو حنيفة فمن احبه وتولاه علمنا انه من اهل السنة ومن ابغضه علمنا انه من اهل البدعة.

ترجمہ: حافظ عبدالعزیز بن ابی داؤد نے کہا جس نے امام ابوحنیفہ سے محبت کی وہ سنی ہے اور جس نے آپ ا سے بغض رکھا وہ بدعتی ہے اور انہیں سے منقول ہے: ہمارے اور لوگوں کے درمیان وجہ امتیاز ابوحنیفہ ا ہیں جس نے آپ سے محبت رکھی ہم سمجھتے ہیں کہ وہ اہل سنت میں سے ہے اور جس نے آپ سے بغض رکھا ہم سمجھتے ہیں کہ وہ اہل بدعت میں سے ہے۔

اور ابراہیم ابن معاویہ کا بیان ہے:

الخیرات الحسان: ۴۸۔

من تمام السنة حب ابی حنيفة.

ترجمہ: امام ابوحنیفہ ا سے محبت مکمل طور پر اہل سنت میں سے ہونے کی علامت ہے۔

بہر حال حقیقت یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ ا کے بارے میں یا تو خدا ناترس حاسدین نے زبان کھول کر چاند پر تھوکنے کی کوشش کی ہے یا غلط فہمی کے باعث اس طرح کی بات کہی گئی ہے، اس لئے محقق علماء جیسے حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ امت کے ائمہ کہ بارے میں کوئی جرح مقبول نہیں، غور کرو کہ ابراہیم نخعی پر شعبی نے کلام کیا ہے، ربیع، ابوالزناد اور ابوبکر اعمش پر ابن شہاب زہری نے کلام کیا ہے، امام مالک ا نے محمد بن اسحاق پر اور ابن ابی ذئب نے خود امام مالک ا پر جرح کی ہے یحیٰی ابن معین کی امام شافعی ا پر تنقید معلوم ہے، امام احمد ا پر امام کرابیسی نے جرح کی ہے اور ان کو بہت سے اہل علم نے فقیہ ماننے ہی سے انکار کردیا یہاں تک کہ حافظ ابن عبدالبر نے ''الانتقاء'' میں بھی ائمہ ثلاثہ کے حالات نقل کئے ہیں اور امام احمد ا کی رائے کو کوئی جگہ نہیں دی، ابن شہاب زہری حدیث کے مدونِ اول ہیں اور دوسری کتب حدیث ہی نہیں، خود صحیحین کی کتنی احادیث میں کہ زہری ہی پر ان کا انحصار ہے لیکن مصر کے معروف محدث اور فقیہ لیث ابن سعد نے ان پر بھی کلام کیا ہے امام بخاری کو امام زہلی نے مجروح قرار دیا ہے اس لئے امام ابوحنیفہ ا اور اس شان کے جلیل القدر فقہاء ومحدثین پر (جن کے بارے میں ان کے معاصرین کا اعتراف موجود ہو) بعد کے علماء کی تنقید کا کوئی اعتبار نہیں۔

اخیر میں دل چاہتا ہے کہ امام ابوحنیفہ ا کے اس مختصر تذکرہ کو مشہور

الخیرات الحسان ۴۹۔

دیکھئے: اعلام الموقعین ۷۳۔ ۷۲۔

محدث ایوب سختیانی اور ایک شافعی عالم علامہ محمد بن یوسف دمشقی کے اقتباس پر ختم کروں، حماد ابن زید، ایوب سختیانی کے بارے میں نقل کرتے ہیں کہ ان کے سامنے کسی نے امام ابوحنیفہ ا کی شان میں تنقیص کی تو انہوں نے فرمایا:

يريدون ان يطفئوا نور اللّٰه بافواههم ويأبى اللّٰه الا ان يتم نوره وقد رأينا مذاهب جماعة ممن تكلم فى ابى حنيفة قد ذهبت واضمحلت ومذهب ابى حنيفة باق الى يوم القيٰمة وكلما قدم ازداد نورًا وبركةً والناس الاٰن مطبقون علىٰ ان اصحاب السنة والجماعة هم اهل المذاهب الاربعة مثل ابى حنيفة ومالك والشافعى واحمد وكل من تكلم فى مذهب ابى حنيفة درس مذهبه حتى لايعرف ومذهب ابى حنيفة باق ملئ الأرض شرقها وغربها واكثر الناس عليه.

ترجمہ: لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کو مکمل کر کے ہی رہیں گے، امام ابوحنیفہ ا پر کلام کرنے والے لوگوں کے مذاہب کے بارے میں ہم نے دیکھا کہ وہ ختم ہو گئے یا کمزور ہو گئے اور امام ابوحنیفہ کا مذہب قیامت تک کے لئے باقی ہے اور آئے دن اس کا نور اور اس کی برکت میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے آج تمام مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ ائمہ اربعہ امام ابوحنیفہ ا امام مالک ا امام شافعی ا اور احمد کے مقلدین ہی اہلسنت والجماعت ہیں، جن لوگوں نے امام ابوحنیفہ ا کے مذہب پر کلام کیا، ان کا مذہب ایسا مٹ گیا کہ اب اس کا پتہ بھی نہیں چلتا اور امام ابو

عقود الجواهر المنيفة: ١/١٥۔

First Proof	15-06-09
Second Proof	05-08-09
FINAL	00-00-00
TOTAL-PAGE	

Work\Zam e-Aitada

حنیفہ ا کا مذہب پورے روئے ارض پر مشرق و مغرب میں باقی ہے اور اکثر لوگ اسی پر عمل پیرا ہیں۔

اور علامہ دمشقی رقمطراز ہیں:

وقد جهد كثير منهم علىٰ ان يحطون مرتبة الامام ابى حنيفة ويصرف قلوب اهل العصر من محبته فما قدر علىٰ ذلك ولا نفذ كلامه فيه حتى قال بعضهم فعلمنا انه امر سماوى لاحيلة لاحدٍ فيه ومن يرفعه اللّٰه تعالىٰ لايقدر الخلق علىٰ خفضه.

ترجمہ: بہت سے لوگوں نے امام ابوحنیفہ کے مقام کو گرانا اور اہل زمانہ کے قلوب کو آپ کی محبت سے پھیرنا چاہا مگر وہ اس پر قادر نہ ہو سکے اور ان کی بات بے اثر ہی رہی، یہاں تک کہ بعض حضرات نے کہا کہ ہمیں اس سے اندازہ ہو گیا کہ یہ آسمانی فیصلہ ہے، کسی کو اس کی طاقت نہیں، سچ ہے کہ اللہ جسے بلند کرے اسے کوئی پست نہیں کر سکتا۔

اکابر محدثین اور علماء رجال و ناقدین کی حضرت امام ابوحنیفہ کی شان میں جو توصیف اور توثیق اوپر مذکور ہوئی ہے، جس میں بعض اقوال از راہِ اختصار درج نہیں کئے گئے ہیں، ان کے بعد ان چند تنقیدات پر گفتگو کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی جو محض غلط فہمی اور حسد پر مبنی ہیں اور حافظ ابن حجر اور علامہ سیوطی جیسے لوگ خود ہی اس کی تردید کر چکے ہیں۔ پس اس بات کو یاد رکھنا چاہئے جو اوپر بعض سلف صالحین کے حوالہ سے گذر چکی ہے کہ امام ابوحنیفہ سے محبت اہل سنت والجماعت میں سے ہونے کی علامت ہے اور آپ ا سے بغض اہل بدعت میں سے ہونے کی۔

عقودالجمان ٣٧١۔ ٣٧٢۔ دیوبند۔

نماز میں ہاتھ کہاں باندھا جائے؟

نماز میں قیام کی حالت میں ہاتھ باندھا جائے یا نہیں اور باندھا جائے تو کہاں..........؟ اس سلسلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، امام مالک I کے نزدیک ہاتھ کھلا رکھا جائے گا جس کو ارسال کہتے ہیں، امام ابوحنیفہ I کے نزدیک ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا بہتر ہے، امام شافعی I کے نزدیک سینہ پر ہاتھ باندھنا اولیٰ ہے، امام احمد I کے نزدیک دونوں ہی باتوں کی گنجائش ہے اور دونوں برابر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اتنا احادیث سے ثابت ہے کہ معمول مبارک ہاتھ کے باندھنے کا تھا لیکن ہاتھ کہاں باندھتے تھے، سینہ پر، سینہ کے نیچے، ناف کے اوپر، ناف کے نیچے؟ یہ تفصیل معتمد اور معتبر طریقہ سے ثابت نہیں۔

1 بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسنون طریقہ ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کا ہے، چنانچہ ابوجحیفہ سے منقول ہے کہ حضرت علی r نے فرمایا:

من السنة وضع الكف على الكف فى الصلوٰة تحت السرة. 🗁

ترجمہ: نماز میں ناف کے نیچے ہاتھ پر ہاتھ رکھنا سنت ہے۔

اور ظاہر ہے کہ صحابی جب سنت کہے تو اس سے سنت نبوی s ہی مراد ہوتی ہے، علامہ زیلعی I نے ابن عبدالبر سے نقل کیا ہے:

🗁 ابو داؤد مع المنهل العذب ۱۶۳/۳ ـ مصنف ابن ابی شیبه ۳۱۹/۱، دارقطنی ۲۸۶/۱، الفتح الربانی ۱۷۱۳ـ

واعلم ان الصحابی اذا اطلق اسم السنة فالمراد به سنة النبی صلی اللّٰه علیه وسلم. 🗁

ترجمہ: صحابی جب کسی بات کو سنت کہیں تو اس سے حضور s کی سنت مراد ہوتی ہے۔

اس روایت میں ایک راوی عبدالرحمان بن اسحاق واسطی آئے ہیں جن کو عام طور پر محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے لیکن حافظ ابن حجر نے ''القول المسدد'' میں نقل کیا ہے کہ ترمذی نے ان کی ایک حدیث کو حسن قرار دیا ہے، حاکم نے صحیح قرار دیا ہے اور ابن خزیمہ نے بھی ان سے روایت لی ہے 🗎 گویا یہ روایت فی الجملہ معتبر ہے۔

2 حضرت وائل بن حجر r سے مروی ہے:

رأيت النبی صلی اللّٰه علیه وسلم یضع یمینه علیٰ شماله فی الصلوٰة تحت السرة.

میں نے حضور s کو دیکھا کہ آپ s نماز میں ناف کے نیچے بائیں ہاتھ پر دایاں ہاتھ رکھا کرتے تھے۔

یہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ کی ہے، مصنف کے موجودہ نسخوں میں یہ روایت موجود نہیں، لیکن حافظ قاسم بن قطلو بغا، علامہ محمد ابوالطیب المدنی اور شیخ عابد سندھی جیسے علماء و محدثین نے خود اس حدیث کو کتاب میں دیکھا ہے، اور علامہ قائم سندھی نے اس کا معائنہ کیا ہے 🗏 اس لئے اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں، کیوں کہ یہ کتاب بہت عرصہ قلمی صورت میں رہی ہے اور ایسے قلمی نسخوں میں بعض حصوں کا نقل سے رہ جانا مستبعد نہیں اور یہ حقیقت اہل علم سے مخفی نہیں۔

🗁 نصب الرایه ۳۱٤/۱ـ

🗎 القول المسدد:۳۵ـ

🗏 آثار السنن مع التعلیق الحسن ۷۰،۷۱/۱ـ

3، 4 بعض تابعی جیسے ابراہیم نخعی[1] اور ابومجلز [2] سے بھی ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کا معمول ثابت ہے۔

5 ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہ r سے نقل کیا ہے:

اخذ الکف علی الکف فی الصلاۃ تحت السرۃ.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ r نے نماز میں ناف کے نیچے ایک ہاتھ پر دوسرا ہاتھ رکھا۔

اس روایت میں بھی عبدالرحمان بن اسحاق واسطی ہیں۔

ان کے علاوہ علامہ ابن حزم نے حضرت ابوہریرہ r سے نقل کیا ہے:

وضع الکف علی الکف فی الصلاۃ تحت السرۃ.

ترجمہ: انہوں نے نماز میں ناف کے نیچے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔

6 اور حضرت انس r سے روایت کیا ہے:

ثلث من اخلاق النبوۃ تعجیل الافطار وتاخیر السحور ووضع الید الیمنٰی علی الیسریٰ فی الصلاۃ تحت السرۃ. [3]

ترجمہ: تین باتیں اخلاق نبوی میں سے ہیں افطار میں عجلت، سحری میں تاخیر اور ناف کے نیچے بائیں ہاتھ پر دایاں ہاتھ بہ حالت نماز رکھنا۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سینہ پر ہاتھ باندھنے کا معمول تھا، چنانچہ وائل بن حجر ا سے روایت ہے:

[1] مصنف ابن ابی شیبہ ۳۹۰/۱۔

[2] ابوداؤد مع المنہل ۱۶۵/۳، مصنف ابن ابی شیبہ ۳۹۱/۱۔

[3] الجوہر النقی ۳۲/۲۔۳۱۔

صلیت مع رسول اللّٰہ ووضع یدہ الیمنی علٰی یدہ الیسریٰ علٰی صدرہ.[1]

ترجمہ: میں نے رسول s کے ساتھ نماز ادا کی، آپ s نے بائیں ہاتھ پر دایاں ہاتھ سینہ کے اوپر رکھا۔

یہ روایت سینہ پر ہاتھ باندھنے کے سلسلے میں سب سے قوی دلیل سمجھی جاتی ہے لیکن اس کے راوی مؤمل بن اسماعیل ہیں، امام بخاری نے ان کو ''منکر الحدیث'' قرار دیا ہے، امام ابوحاتم نے کہا ہے کہ یہ نقل روایت میں بہت غلطی کرتے ہیں ''کثیر الخطاء'' امام ابوزرعہ نے بھی کہا ہے کہ ان کی نقل روایت میں بکثرت غلطی ہوتی ہے، **فی حدیثہ خطأ کثیر.** [2]

سینہ پر ہاتھ باندھنے کے سلسلے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ ''**فصل لربک وانحر**'' کی تفسیر میں حضرت علی اور حضرت عبداللہ ابن عباس p سے منقول ہے کہ اس سے سینہ پر ہاتھ باندھنا مراد ہے [3] لیکن اول تو ان روایتوں کے ضعیف ہونے پر یہی شہادت کافی ہے کہ مفسرین ومحدثین نے اس تفسیر پر اعتبار نہیں کیا ہے اور یہ تفسیر اپنے سیاق وسباق سے مطابقت بھی نہیں رکھتی ہے، دوسرے سند کے اعتبار سے بھی یہ روایت حد درجہ ضعیف ہے، اس میں ایک راوی روح بن مسیّب ہیں جن کے بارے میں ابن حبان نے لکھا ہے کہ یہ موضوع روایتیں نقل کرتے ہیں، ایک اور راوی ''عمرونکری'' نام کے ہیں یہ بھی حد درجہ ضعیف ہیں، ابن عدی نے ان کو منکر الحدیث اور حدیثوں کا سارق قرار دیا ہے۔[4]

[1] صحیح ابن خزیمہ: ۲۴۳/۱۔ مراسیل ابو داؤد: ۶/۔ مع سنن ابی داؤد سجستانی۔

[2] الجواہر النقی علیٰ سنن البیہقی ۳۰/۲۔

[3] بیہقی ۲۴۳/۲۔

[4] الجواہر النقی مع البیہقی ۳۱/۲۔۳۰۔

نیز مسند احمد بن حنبل میں قبیصہ ابن ھلب کے واسطہ سے ان کے والد حضرت ھلب سے نقل کیا گیا ہے:

رأيت النبی صلی اللّٰه علیه وسلم ینصرف عن یمینه وعن یساره ورأيته یضع هذه علٰی صدره وصف یحیٰ الیمنی علی الیسریٰ فوق المفصل.

ترجمہ: میں نے رسول s کو (نماز کے بعد) کبھی دائیں طرف سے نکلتے ہوئے دیکھا اور کبھی بائیں طرف سے اور میں نے دیکھا کہ ''اس کو اس پر'' سینہ پر رکھا، راوی حدیث یحییٰ نے کہا کہ مراد یہ ہے کہ دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر گٹوں کے اوپر رکھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس روایت میں ''علٰی صدرہ'' کا اضافہ ثابت نہیں ہے کہ کیوں کہ اس روایت کو ترمذی، ابن ماجہ اور دارقطنی نے بھی نقل کیا ہے اور مسند احمد میں بھی دوسری سندوں سے روایت منقول ہے لیکن ان میں یہ اضافہ موجود نہیں، علامہ نیموی کی تحقیق یہ ہے کہ اصل میں روایت کے الفاظ تھے **یضع هذه علٰی هذه** (اس ہاتھ کو اس ہاتھ پر رکھتے تھے) اور راوی نے اس کو ''**یضع علٰی صدره**'' روایت کر دیا، اسی لئے مجمع الزوائد، سیوطی کی جمع الجوامع اور علی متقی الہندی کی کنز العمال میں اس اضافہ کے ساتھ یہ روایت موجود نہیں ہے، حالاں کہ ان حضرات نے مسند احمد کی روایات کو بھی جمع کیا ہے۔

مسند ابوداؤد طیالسی میں طاؤس سے نقل کیا گیا ہے:

كان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یضع یده الیمنی

مسند احمد۔

التعلیق الحسن علیٰ آثارالسنن ٦٨/١۔

علٰی یده الیسریٰ ثم یشبک بهما علی صدره وهو فی الصلاة.

ترجمہ: رسول s دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھتے تھے اور ان دونوں میں تشبیک کر کے سینہ پر رکھتے تھے جب نماز کی حالت میں ہوتے۔

اوّل تو اس روایت کی سند متصل نہیں کیوں کہ طاؤس صحابی رسول نہیں ہیں، اس لئے ضرور ہے کہ انہوں نے کسی اور راوی سے سن کر روایت کی ہو، دوسرے اس کی سند میں سلیمان بن موسیٰ ہیں جو طاؤس سے روایت کرتے ہیں، امام نسائی نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ قوی نہیں ہیں، ''**لیس بالقوی**'' اور بخاری کا بیان ہے کہ ان کے یہاں ضعیف روایتیں پائی جاتی ہیں، **عنده مناکیر**۔

بعض روایتوں میں ناف کے اوپر ہاتھ باندھنے کا ذکر ہے، نہ سینہ پر اور ناف کے نیچے، چنانچہ جریر ضبی نقل کرتے ہیں:

رأيت علیًا یمسک شماله بیمینه علی الرسغ فوق السرة.

ترجمہ: میں نے حضرت علی r کو دیکھا آپ ناف کے اوپر دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کو گٹوں پر تھامے رہتے تھے۔

یہ اثر بسند صحیح منقول ہے اور نماز جیسے مسئلہ میں حضرت علی r کا یہ عمل بظاہر طبع زاد نہیں ہوسکتا بلکہ ضرور ہے کہ آپ r نے ایسا حضور s کو دیکھتے ہوئے کیا ہوگا۔

حاصل یہ ہے کہ اس سلسلے میں حضور s کا عمل صحیح سند سے حضرت وائل

مراسیل ابو داؤد: ٦/ مع سنن ابی داود سجستانی۔

التعلیق الحسن: ٦٨/١۔

ابو داؤد مع المنهل ١٦٤/٣۔

ابن حجر r سے مروی ہے اور حضرت وائل کی اکثر روایات میں صرف اتنا سا ذکر ہے کہ آپ s نے دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھا، اس کا ذکر نہیں کہ آپ s نے ہاتھ کہاں باندھا؟ کم سے کم اس مسئلہ میں حضرت وائل r سے بتیس (۳۲) سندوں سے ایسی روایتیں منقول ہے کہ جس میں صرف دایاں ہاتھ کو بایاں ہاتھ پر باندھنے کا ذکر ہے، اس بات کا ذکر نہیں کہ ہاتھ کہاں باندھا جائے؟ [1] اس لئے ہاتھ باندھنے کی جگہ کی بابت کوئی صحیح اور قوی روایت موجود نہیں، اس لئے علامہ ابن ہمام نے لکھا ہے، **لم یثبت فیہ حدیث یوجب العمل.** [2]

اور صحاح ستہ کے مصنفین نے اس مسئلہ پر ہاتھ کہاں باندھا جائے کوئی گفتگو ہی نہیں کی ہے، صرف ابوداؤد کے بعض نسخوں میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا ہے، اس لئے اس مسئلہ میں وسعت اور گنجائش معلوم ہوتی ہے کہ سینہ پر یا سینہ سے نیچے اور ناف کے اوپر ناف کے نیچے تمام ہی صورتیں درست ہیں۔

امام ترمذی کی بات بہت درست ہے:

والعمل علیٰ هذا عند اهل العلم من اصحاب النبی والتابعین ومن بعدهم یرون ان یضع الرجل یمینه علی شماله فی الصلاة ورأی بعضهم ان یضعها فوق السرة ورأی بعضهم ان یضعها تحت السرة وکل ذلک واسع عندهمَ. [3]

ترجمہ: حضرات صحابہ p تابعین اور بعد کے اہل علم کا خیال ہے کہ

[1] دیکھئے حاشیہ نصب الرأیة: ۳۱۶/۱۔

[2] فتح القدیر: ۶۸۷/۱۔

[3] ترمذی ۵۹/۱۔

نماز کی حالت میں آدمی دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھے اب بعض حضرات کا خیال ہے کہ ناف کے اوپر رکھے اور بعض کی رائے ہے کہ ناف سے نیچے رکھے، غرض ان حضرات کے نزدیک اس مسئلہ میں وسعت اور کشادگی ہے۔

البتہ ہاتھ باندھنے کا مقصود اللہ تعالیٰ کی تعظیم و اجلال ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے میں تعظیم کی کیفیت زیادہ پائی جاتی ہے اس لئے ناف کے نیچے ہاتھ کا باندھنا افضل معلوم ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

[ ]

امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی تلاوت

اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ نماز میں امام اور تنہا نماز پڑھنے والے کے لئے سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب ہے، خود امام ابوحنیفہ ا کے نزدیک بھی اگر سورۂ فاتحہ پڑھنا بھول جائے تو سجدۂ سہو کرنا ہوگا اور سجدۂ سہو نہ کر سکے تو نماز نہیں ہوگی، نماز کا اعادہ واجب ہوگا۔

البتہ اس سلسلہ میں اختلاف ہے کہ مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھیں گے یا نہیں؟ اما ابوحنیفہ ا کے مشہور قول کے مطابق جہری نماز ہو یا سری امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنا درست نہیں [1] امام مالک ا کے نزدیک بھی جہری نماز ہو یا سری مقتدی کو سورۂ فاتحہ پڑھنے کی ضرورت نہیں [2] البتہ سری نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھ لینا مستحب ہے [3] حنفیہ میں امام محمد ا سے بھی ایک قول اسی طرح نقل کیا گیا ہے [4] یہی رائے فقہاء حنابلہ کے یہاں بھی راجح ہے [5] امام شافعی ا کا قول قدیم یہ ہے یہ کہ جہری نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب نہیں سری نماز میں واجب ہے، قول جدید میں اختلاف ہے لیکن راجح

[1] مجمع الانہر ۱۰۶/۱۔

[2] الشرح الصغیر ۳۰۹/۱۔

[3] حاشیہ حاوی علی الشرح الصغیر ۳۰۹/۱۔

[4] مجمع الانہرا ۱۰۶/۱۔ بحر الرائق ۳۴۳/۱۔

[5] الروض المربع/۷۷۔

قول کے مطابق جہری نماز ہو یا سری سورۂ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے [1] تاہم فقہاء شوافع کے یہاں سورۂ فاتحہ کے لئے امام کچھ وقفہ دے گا اور اسی وقفہ میں مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھیں گے یا ہر آیت پر جو سکتہ ہوتا ہے اس سکتہ میں مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھے گا [2] صحاح ستہ کے مصنفین میں امام ترمذی اور ابوداؤد کا رجحان جہری نمازوں میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کی ممانعت کا ہے، نسائی اور ابن ماجہ نے دونوں نے نقاط نظر کے مطابق عنوان قائم کرنے پر اکتفا کیا ہے، غالباً ان حضرات M کو اس مسئلہ میں تذبذب ہے امام مسلم چونکہ خود عنوانات قائم نہیں کرتے اس لئے ان کا نقطہ نظر واضح نہیں البتہ امام بخاری امام اور مقتدی ہر ایک کے لئے اور جہری و سری دونوں نمازوں میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کو واجب قرار دیتے ہیں، غرض فقہاء و محدثین کی آراء کا خلاصہ یہ ہوا کہ:

1 امام اور تنہاء نماز پڑھنے والے کیلئے بالاتفاق سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب ہے۔

2 مقتدی پر جمہور فقہاء یعنی حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب نہیں البتہ مالکیہ اور ایک قول کے مطابق امام ابوحنیفہ ا کے نزدیک سری نمازوں میں سورۂ فاتحہ پڑھ لینا بہتر ہے امام ترمذی اور ابوداؤد کا رجحان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے۔

3 سری اور جہری دونوں نمازوں میں مقتدی بھی سورۂ فاتحہ پڑھے، یہ امام شافعی ا کا قول جدید اور امام بخاری کی رائے ہے۔ تاہم امام شافعی ا کے نزدیک سورۂ فاتحہ آیتوں کے درمیان سکتہ یہ سورۂ فاتحہ کے بعد وقفہ میں پڑھا جائے گا صرف موجودہ زمانہ کے غیر مقلدین کا خیال ہے کہ گو امام سورۂ فاتحہ پڑھنے میں مشغول ہو پھر بھی مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھ لے گا، گویا مقتدی کے لئے سورۂ فاتحہ میں استماع اور انصات (توجہ سے سننا اور خاموش رہنا) کا حکم قرآنی ہے ہی نہیں اور اگر مقتدی نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی تو اس کی نماز ہی درست نہیں۔

[1] شرح مہذب ۳۶۴/۳۔

[2] شرح مہذب ۳۶۶/۳۔

قرآن مجید:

امام ابوحنیفہ ا کے دلائل ...... دوسرے بزرگوں کی رائے کی ادنیٰ تنقیص کئے بغیر........... بہت قوی ہیں۔سب سے پہلے قرآن مجید کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اذا قُرئ القراٰنُ فاسْتمعُوا له و انصتوا لعلكم تُرحمون.

(اعراف: ۲۰۴)

ترجمہ: جب قرآن پڑھا جائے تو غور سے سنو اور خاموش رہو، شاید تم پر رحم کیا جائے۔

حدیث کی مشہور کتاب سنن بیہقی میں مجاہد ا سے نقل کیا گیا ہے کہ انصار میں سے کچھ نوجوان امام کے پیچھے بھی قرآن مجید پڑھا کرتے تھے اسی کی ممانعت کے لئے یہ آیت نازل ہوئی اور مشہور محدث وفقیہ امام احمد بن حنبل ا سے بیہقی سے نقل کیا ہے کہ لوگوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ آیت نماز ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے 🗁

ابن کثیر نے امام زہری سے بھی وہی بات نقل کی ہے جو اوپر بیہقی کے واسطہ سے امام مجاہد سے ذکر کی گئی ہے 🗎 ابن کثیر نے بھی مجاہد ا سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت نماز کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے نیز سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت جہری نماز سے متعلق ہے 🗏 مشہور مفسر علامہ قرطبی نے حضرت عبداللہ ابن مسعود r حضرت ابوہریرہ، ابن شہاب زہری، عطاء اور سعید بن میسّب سے نقل کیا

🗁 آثار السنن ۱/۸٤۔

🗎 تفسیر ابن کثیر ۲/۲۸۰۔

🗏 حوالۂ سابق ۲/ ۲۸۱۔

First Proof	15-06-09
Second Proof	05-08-09
FINAL	00-00-00
TOTAL-PAGE	

Work\Zam
e-Aitada

ہے کہ یہ آیت نماز ہی کی بابت نازل ہوئی ہے 🗁 علامہ شوکانی نے بیہقی کے حوالہ سے حضرت عبداللہ ابن عباس r سے ہی نقل کیا ہے کہ یہ آیت فرض نمازوں سے متعلق ہے اور علاوہ حضرت عبداللہ بن مسعود r اور امام مجاہد ا کے حضرت عبداللہ بن مغفل r سے بھی روایت کو نقل کیا ہے اور مصنف ابن ابی شیبہ کے واسطے سے حسن بصری سے بھی روایت کی ہے کہ اس آیت کا تعلق نماز سے ہے، خود شوکانی کا بیان ہے:

قدروى نحوهذاعن جماعة من السلف وصر حوابأن هذه الاٰية نزلت فى قراء ة الصلاة من الامام. 🗎

ترجمہ: اس طرح کی بات سلف کی ایک جماعت سے مروی ہے اور انہوں نے صراحت کی ہے کہ یہ آیت امام کی نماز میں قرأت سے متعلق ہے۔

غرض یہ آیت نماز ہی سے متعلق ہے اور امام کے پیچھے قرآن پڑھنے سے منع کرنا مقصود ہے جس میں ظاہر ہے کہ سورۂ فاتحہ بھی داخل ہے۔

احادیث:

نماز میں امام کے پیچھے قرآن مجید بالکل نہ پڑھا جائے، اس سلسلہ میں احادیث اس کثرت سے منقول ہیں کہ ان سبھوں کا ذکر کرنا طول سے خالی نہ ہوگا یہاں چند حدیثیں ذکر کی جاتی ہیں:۔

1 عن ابى هريرة ان رسول اللّٰه دخل المسجد فدخل رجل فصلّٰى وسلّم عَلى النّبى صلى اللّٰه عليه وسلم فرد وقال ارجع فانك لم تصل فرجع فصلى كما صَلّٰى ثم

🗁 تفسیر قرطبی ۷/۳۵۳۔

🗎 فتح القدیر ۲/۳۹۸۔

جاء فسلَّم على النبى صلى الله عليه وسلم فقال ارجع فصل فانک لم تصل ثلاثًا فقال اذاقمت الى الصلاة فكبر ثم اقرأ ماتسير من القراٰن ثم اركع الخ.

(بخاری شریف: ۱/۱۰۴)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ r سے مروی ہے کہ آپ s مسجد میں داخل ہوئے، ایک اور صاحب بھی داخل ہوئے، انہوں نے نماز ادا کی، آپ s کو سلام کیا، پھر آپ s نے جواب دیا اور فرمایا کہ پھر نماز پڑھو کہ تم نے نماز نہیں پڑھی، وہ صاحب لوٹ گئے اور دوبارہ اسی طرح نماز ادا کی، پھر آئے اور آپ s کو سلام کیا، آپ نے پھر لوٹنے اور نماز پڑھنے کا حکم فرمایا، اسی طرح تین بار ہوا، پھر آپ s نے ارشاد فرمایا کہ جب نماز کیلئے کھڑے ہو تو اللہ اکبر کہو پھر قرآن کا جو حصہ بآسانی پڑھ سکتے ہو، پڑھو، اس کے بعد رکوع کرو۔ الخ۔

غور کیجئے کہ اس حدیث میں آپ s نے تکبیر تحریمہ کے بعد محض قرآن کے اس حصہ کو پڑھنے کا حکم فرمایا ہے جو آسانی سے پڑھ سکیں، یہ نہیں فرمایا کہ سورۂ فاتحہ پڑھو، اگر سورۂ فاتحہ کے پڑھنے پر نماز کی ادائیگی موقوف ہوتی تو آپ s کیسے ایسا حکم فرماتے؟؟

2 عن عبدالله ابن بحينه وكان من اصحاب رسول الله ان رسول الله قال هل قرأ أحد منكم معى انفًا قالوا نعم قال انى اقول مالى انازع القراٰن فانتهى الناس عن القراءة معه حين قال ذلک.

ترجمہ: صحابی رسول s حضرت عبداللہ ابن بُحَینہ r سے مروی

مجمع الزوائد بحوالہ مسند احمدوطبرانی: ۱۰/۳۔ ۹۔ ۱۰۔ مجمع البحرین ۱۱۷/۲، مسند احمد: الفتح الربانی: ۱۹۸/۳۔

ہے کہ آپ s نے فرمایا کیا ابھی تم میں سے کسی نے میرے ساتھ قرآن پڑھا ہے؟ لوگوں نے کہا: ہاں، آپ s نے فرمایا: میں کہتا ہوں کہ مجھ سے قرآن میں کیوں جھگڑا جاتا ہے؟ جب آپ s نے یہ فرمادیا تو لوگ قراءت سے رک گئے۔

علامہ ہیثمی نے لکھا ہے کہ اس روایت کے روایت کرنے والے رواۃ، بخاری کے رواۃ ہیں۔

3 عن ابى هريرة ان رسول الله انصرف من صلاة جهر فيها بالقراءة فقال هل قرأ معى منكم انفًا فقال رجل نعم يارسول الله قال انى اقول مالى انازع القراٰن قال فانتهى الناس عن القراءة مع رسول الله فيما يجهر فيه من الصلوات عن القراءة حين سمعوا ذلک من رسول صلى الله عليه وسلم.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ r سے روایت ہے کہ آپ s ایک جہری نماز سے فارغ ہوئے تو دریافت فرمایا کہ کیا ابھی تم میں سے کسی نے میرے ساتھ قراءت کی ہے، ایک شخص نے کہا ہاں اے اللہ کی رسول s آپ s نے فرمایا، مجھ سے کیوں تلاوت قرآن میں نزاع کی جاتی ہے، چنانچہ لوگ جہری نمازوں میں یہ سننے کے بعد آپ s کے ساتھ قرآن پڑھنے سے رک گئے۔

اس کو الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ امام احمد نے بھی بیان کیا ہے۔

4 عن ابى هرهرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم انما جعل الامام ليؤتم به فاذا كبر

ترمذی ۶۹/۱۔

مسند احمد: الفتح الربانی ۱۹۷/۳، موارد الظمان ۱۲۶/۔

فکبروا واذاقرأفانصتو.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ r سے مروی ہے آپ s نے فرمایا کہ امام اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے، پس جب وہ اللہ اکبر کہے تو تم بھی اللہ اکبر کہو اور جب وہ قرآن مجید پڑھے تو تم خاموش رہو۔

ابن ماجہ اور دارقطنی کی ایک روایت میں مزید وضاحت ہے اور یوں روایت نقل کی گئی ہے:

انما جعل الامام ليؤتم به فاذاكبر فكبروا واذاقرأ فانصتوا واذا قال غيرالمغضوب عليهم ولا الضالين فقولوا اٰمين واذا ركع فاركعوا الخ.

ترجمہ: امام اس لئے ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے لہٰذا جب امام تکبیر کہے تو تکبیر کہو اور جب قراءت کرے تو خاموش رہو اور جب **غير المغضوب عليهم ولا الضالين** کہے تو آمین کہو اور جب رکوع کرے تو رکوع میں جاؤ۔

5 عن ابی اکیمه قال سمعت اباهريرة يقول صلى النبی صلى الله عليه وسلم باصحابه صلوة نظن انها الصبح فقال هل قرأمنكم احد قال رجل انا، قال انی اقول مالی انازع القراٰن.

ترجمہ: ابو اکیمہ r سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو ہریرہ r کو کہتے ہوئے سنا کہ رسول s اپنے صحابہ p کو نماز

ابو داؤد، نسائی ١/١٤٦، ابن ماجہ: ٦١، مسند احمد٣/١٩٧، دارقطنی ١/٣٢٧۔

ابن ماجہ ١/٦١۔

ابن ماجہ ٦١/١ ومؤطا امام مالک I۔

پڑھا رہے تھے، میرا گمان ہے کہ وہ صبح کی نماز ہے، آپ s نے پوچھا کہ کیا تم میں سے کسی نے قرآن پڑھا؟ ایک نے کہا میں نے پڑھا ہے، آپ s نے فرمایا: قرآن کے معاملے میں مجھ سے کیوں جھگڑا جاتا ہے (یعنی جب میں قرآن پڑھ رہا ہوں تو پھر تم کیوں قرآن پڑھتے ہو)؟

امام مالک I کی روایت میں یہ اضافہ ہے: **فانتهى الناس عن القرآن مع رسول الله فيما جهرفيه رسولُ الله بالقراء ة حين سمعوا ذٰلک من رسول الله صلى الله عليه واٰله وسلم.**

6 عن ابی الاحوص عن عبدالله بن عمر قال كانوا يقرؤن خلف النبی فقال خلطتم علی القراء ة.

ترجمہ: ابوالاحوص عبداللہ بن عمر r سے نقل کرتے ہیں، انہوں نے کہا لوگ حضور s کے پیچھے قرآن پڑھ رہے تھے تو آپ s نے فرمایا تم لوگ مجھ پر قرآن کو خلط ملط کرتے ہو؟

اصل بات یہ ہے کہ امام کی قراءت چونکہ مقتدی کی طرف سے بھی ہوتی ہے، اس لئے جماعت کی نماز میں مقتدی کے لئے قراءت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

7 عن جابر رضی الله عنه قال قال رسول الله من كان له امام فقراء ة الامام له قراء ة.

ترجمہ: حضرت جابر r سے مروی ہے کہ آپ s نے فرمایا کہ جس کا کوئی امام ہو تو امام کی قراءۃ ہی مقتدی کی طرف سے قراءت ہے۔

ترکمانی نے اس کو مصنف ابن ابی شیبہ کی سند سے نقل کیا ہے اور لکھا ہے

مؤطا امام مالك مع شرح الزرقانی ١/ ١٦٩۔

مسند احمد، ابویعلیٰ، بزار قال الهيثمی رجال احمد رجال الصحيح۔ طحاوی ١٢٨ و طبرانی، مجمع الزوائد٢/١١٠۔

دار قطنی ١/ ٣٢٣، ابن ماجه ١/ ٦١، مؤطا امام محمد، طحاوی ١٢٨۔

ھٰذا سند صحیح ۔

اس مضمون کی روایتیں متعدد صحابۂ کرام p سے منقول ہیں:

8 عن ابی الدرداء قال سُئِل رسُول اللّٰه أفی کل صَلوٰۃٍ قراء ۃ، قال نعم فقال رجل من الانصار وجبت ھٰذه فقال لی رسول اللّٰه وکنت اقرب القوم الیه "ماری الامام اذا ام القوم الّا کفاھم".

ترجمہ: حضرت ابودرداء r راوی ہیں کہ آپ s سے سوال کیا گیا کیا ہر نماز میں قراءت ہے؟ آپ s نے فرمایا ہاں، ایک انصاری نے کہا یہ تو واجب ہوگئی، حضور s نے مجھ سے فرمایا اور میں اس وقت مجلس میں آپ s سے سب سے زیادہ قریب تھا کہ میرا خیال ہے کہ امام کی قراءت مقتدی کو کافی ہو جائے گی۔

علامہ ہیثمی نے اس روایت کو معجم کبیر للطبرانی کے حوالہ سے نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کی سند حسن ہے، اسنادہٗ حسنٌ۔ (مجمع الزوائد ۲/ ۱۱۰)

9 عن ابی موسٰی الاشعری قال علمنا النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال اذا قمتم الی الصلوٰۃ فلیؤم احدکم واذا اقرأ الامام فانصتوا.

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعری r سے مروی ہے کہ حضور s نے ہم لوگوں کو سکھایا اور فرمایا کہ جب تم نماز کو کھڑے ہو تو تم میں سے ایک شخص امامت کرے اور جب امام قراءت کرے تو تم لوگ خاموش رہو۔

الجوھر النقی ۲/ ۱۵۹، سنن بیھقی ۲/ ۱۵۹ کتاب الآثار لامام محمد ۱/ ۱۷۰۔

دار قطنی ۱/ ۳۳۲۔

مسند احمد، دار قطنی ۱/ ۳۳۰، الفتح الربانی ۳/ ۱۹۷۔

- عن ابی موسٰی الاشعری قال قال النبی صلی اللّٰه علیه وسلم اذا قرأ الامام فانصتوا واذا قال غیر المغضوب علیهم ولا الضالین فقولوا آمین.

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعری r سے روایت ہے کہ حضور s نے فرمایا کہ جب امام قرآن مجید پڑھے تو خاموش رہو اور جب غیر المغضوب علیهم ولا الضالین کہے تو آمین کہو۔

q عن ابن مسعود قال کانوا یقرؤن خلف رسول اللّٰه فقال خلطتم علی القرآن.

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن مسعود r سے مروی ہے کہ لوگ رسول اللہ s کے پیچھے قرآن پڑھا کرتے تھے، آپ s نے فرمایا تم لوگوں نے مجھ پر قرآن کو خلط ملط کر دیا ہے۔

علامہ ہیثمی نے لکھا ہے رجال احمد رجال الصحیح۔

w عن عمران بن حصین قال کان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم یصلی بالناس ورجل یقرأ خلفه فلما فرغ قال من ذا الذی یخالجنی سورۃ کذا فنهاھم عن القراء ۃ خلف الامام.

ترجمہ: حضرت عمران بن حصین r سے مروی ہے کہ حضور s لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے اور ایک شخص آپ s کے پیچھے قرآن پڑھ رہا تھا جب

مسند ابوعوانہ۔

مجمع الزوائد بحوالہ مسند احمد، مسند ابویعلیٰ، مسند بزار ۲/ ۱۱۰، طحاوی ۱۲۸۔

الفتح الربانی ۳/ ۱۹۸۔

بیھقی ۲/ ۱۶۲۔ دارقطنی ۱/ ۳۳۶۔

آپ s اس سے فارغ ہوئے تو فرمایا کون ہے جو مجھ پر فلاں سورت کو خلط ملط کر رہا ہے؟ پھر آپ s نے لوگوں کو امام کے پیچھے قرآن پڑھنے سے منع فرمایا۔

مسلم نے بھی اسے روایت کیا ہے لیکن اس میں فنھاھم الخ کے الفاظ نہیں ہیں۔

e عن انس r ان النبی قال أتقرون فی صلوتکم خلف الامام والامام یقرأ فسکتوا فقالها ثلاثًا فقالوا انا لنفعل فقال لاتفعلوا.

ترجمہ: حضرت انس r سے مروی ہے کہ حضور s نے فرمایا کیا تم لوگ اپنی نماز میں امام کے پیچھے قرآن پڑھتے ہو حالانکہ امام بھی قرآن پڑھ رہا ہوتا ہے؟ لوگ خاموش رہے تو آپ s نے تین بار یہی باتیں فرمائیں، لوگوں نے کہا ہم لوگ ایسا ہی کرتے ہیں، آپ s نے فرمایا ایسا نہیں کرو۔

r عن جابر عن عبداللّٰہ عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم انه قال من صلی رکعة ولم یقرأ فیها بام القرآن فلم یصل الاوراء الامام.

ترجمہ: حضرت جابر r حضور s سے نقل کرتے ہیں کہ آپ s نے فرمایا جس نے ایک رکعت نماز پڑھی اور اس میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی تو اس کی نماز نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ وہ امام کے پیچھے ہو اور مقتدی ہو۔

دارقطنی نے اس روایت کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

مسلم ۱/ ۱۷۲۔ مسند احمد: الفتح الربانی ۳/ ۱۹۹۔

طحاوی: ۱۲۸۔

طحاوی ۱۲۸، ورواہ مالك والترمذی موقوفًا ۱/ ۷۱۔ مؤطا امام مالك مع الزرقانی ۱/۱۷۵۔ بیهقی ۲/ ۱۶۰۔

First Proof	15-06-09
Second Proof	05-08-09
FINAL	00-00-00
TOTAL-PAGE	

عن جابر بن عبداللّٰہ رضی اللّٰہ عنه ان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: کل صلاة لایقرأ فیها بام الکتاب فهی خداج الا ان یکون وراء الامام.

ترجمہ: حضرت جابر r سے روایت ہے کہ آپ s نے فرمایا جس نماز میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ ناقص ہے سوائے اس کے کہ امام کے پیچھے ہو۔

t عن ابن عباس قال کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یقول من صلی رکعة ولم یقرأ فیها بام الکتاب فلم یصل الاوراء الامام.

ترجمہ: عبداللہ ابن عباس q سے مروی ہے کہ حضور s فرمایا کرتے تھے جو ایک رکعت نماز پڑھے اور اس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے تو اس نے نماز نہیں پڑھی سوائے اس کے کہ امام کے پیچھے ہو۔

حضرت جابر بن عبداللہ r سے مروی ہے:

y من صلی رکعة لم یقرأ فیها بام القرآن فلم یصل الاوراء الامام.

ترجمہ: جس نے ایک رکعت نماز پڑھی اور اس میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی، اس کی نماز نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ امام کے پیچھے ہو۔

u عن عون ابن عباس رضی اللّٰہ عنه عن النبی

دارقطنی ۱/ ۳۲۷۔

کشف الغمه عن جمیع الامة للشعرانی۔

بیهقی ۲/ ۱۶۰۔

صلی اللہ علیہ وسلم قل تکفیک قراء ۃ الامام حافت او جھر.

ترجمہ: حضرت ابن عباس r ناقل ہیں کہ آپ s نے فرمایا: امام کی قراءت تمہارے لئے کافی ہے جہری نماز ہو یا سری۔

اس روایت میں ایک راوی عاصم بن عبدالعزیز ہیں جن کو دارقطنی نے ضعیف قرار دیا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ راوی ثقہ اور معتبر ہیں اور امام ترمذی اور ابن ماجہ نے ان سے روایت کی ہے۔

i عن زید بن ثابت قال قال النبی s من قرأ خلف الامام فلا صلوٰۃ لہ.

ترجمہ: زید بن ثابت r سے مروی ہے کہ جس نے امام کے پیچھے قرآن پڑھا تو اس کی نماز نہیں ہوئی۔

حضرت ابوسعید خدری r سے مروی ہے کہ آپ s نے فرمایا:

o من کان لہ امام فقراۃ الامام لہ قراء ۃ.

ترجمہ: جو امام کے پیچھے نماز پڑھے اس کے حق میں امام کی قراءت ہی اس کی قراءت ہے۔

اس حدیث کی سند گو ضعیف ہے لیکن بہر حال دوسری روایات کے لئے تائید و تقویت کا باعث ہے۔

دارقطنی ۱/ ۳۳۱۔

دیکھئے تقریب التہذیب ۱/ ۲۸۵۔

امام الکلام للعلامہ لکھنوی ص: ۳۳۔

مجمع البحرین ۲/ ۱۱۸۔

آثار صحابہ r:

احادیث کے بعد دین میں سب سے زیادہ اہمیت صحابۂ کرام p کے عمل اور ان کے اقوال و ہدایات کو حاصل ہے اس لئے کہ انہوں نے حضور s کی زندگی کو بچشم سر دیکھا تھا اور آپ s کے ایک ایک عمل اور سنت کو اپنی جان اور اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، دین اور بالخصوص عبادات کے معاملے میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ یا کمی بدعت ہے۔ اگر صحابہ p کے عمل کے بارے میں یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ وہ حضور s کی ہدایت، عمل اور سنت کے خلاف عمل کیا کرتے تھے تو یہ گویا ان کو "بدعتی" قرار دینے کے مرادف ہوگا حالانکہ کوئی مسلمان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

اس لئے اب یہاں چند صحابہ کرام p کے اعمال اور ان کے ارشادات بھی ملاحظہ کر لئے جائیں۔

1 حضرت جابر بن عبداللہ r نے فرمایا:

من صلی رکعۃ لم یقرأ فیھا بام القراٰن فلم یصل الا وراء الامام.

ترجمہ: جس نے ایک رکعت نماز پڑھی اور سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی اس نے نماز نہیں پڑھی سوائے اس کے کہ امام کے پیچھے ہو۔

2 حضرت زید بن ثابت r سے منقول ہے:

لاقراء ۃ مع الامام فی شیئٍ.

ترجمہ: امام کی اقتداء میں کچھ بھی قراءت نہ کی جائے۔

ایک اور روایت میں حضرت زید بن ثابت r سے منقول ہے: مــــن

مؤطا امام مالک r مع الزرقانی ۱/ ۱۷۵۔

مسلم، بابُ سجود التلاوۃ ۱/ ۲۱۵۔

قرأ وراء الامام فلا صلاۃ[1] اور مصنّف عبدالرزاق میں "فلا صلاۃ له" کے الفاظ ہیں۔ [2]

3 عبداللہ ابن مقسم r نے ان دونوں بزرگوں کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عمر r سے مقتدی کی قراءت کے متعلق پوچھا تو سبوں نے جواب دیا:

لایقرأ خلف الامام فی شئیٍ من الصلاۃ. [3]

ترجمہ: امام کے پیچھے نماز میں قرآن بالکل نہ پڑھے۔

حضرت عبداللہ بن عمر r کے بارے میں مروی ہے۔

کان اذا سئل هل یقرأ احد خلف الامام قال اذا صلی احدکم خلف الامام فحسبه قراءۃ الامام واذا صلی وحده فلیقرأ. [4]

ترجمہ: جب ان سے دریافت کیا جاتا کہ کیا امام کے پیچھے قراءت کی جائے تو فرماتے کہ جب تم میں سے کوئی امام کے پیچھے نماز پڑھے تو اس کے لئے امام کی قراءت کافی ہے اور جب تنہا نماز پڑھے تو خود قراءت کرے۔

نیز قاسم بن محمد ا راوی ہیں:۔

کان ابن عمر لایقرأ خلف الامام جهر اولم یجهر. [5]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر r امام کے پیچھے قراءت نہیں کرتے تھے، جہری نماز ہو یا سری۔

---

[1] بیهقی ۲/ ۱۶۳۔

[2] مصنف عبدالرزاق ۲/ ۱۳۷۔

[3] طحاوی ۱/ ۱۲۹۔

[4] مؤطا امام مالك مع شرح زرقانی ۱/ ۱۷۸، بیهقی ۲/ ۱۶۱۔

[5] بیهقی ۲/ ۱۶۱۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت ابن عمر r قراءت خلف الامام سے منع فرمایا کرتے تھے[1]

4 حضرت عبداللہ ابن مسعود r جن کے بارے میں حضور s نے فرمایا کہ ابن مسعود r میری امت کے لئے جس بات کو پسند کریں اس کو میں نے پسند کیا اور جس سے ابن مسعود r راضی نہیں ہوئے اس سے میں راضی نہیں ہوا۔ [2] اور جن کے متعلق حضرت حذیفہ r نے فرمایا کہ اخلاق واطوار میں ابن مسعود r سے زیادہ حضور s کے مشابہ کوئی اور نہ تھا [3] انہوں نے امام کے پیچھے تلاوت قرآن کے متعلق فرمایا:

انصت للقراءۃ فان فی الصلوۃ شغلاً وسیکفیک ذلک الامام[4]

ترجمہ: قرآن مجید پڑھتے وقت خاموش رہو اس لئے کہ نماز میں ایک خاص مصروفیت ہے اور قراءت کے لئے تمہارا امام کافی ہے۔

علامہ ہیثمی نے لکھا ہے کہ اس کے رواۃ ثقہ ہیں **ورجاله مؤثقون.** [5]

اور یہ کہ:

لیت الذی یقرأ خلف الامام ملئی فوه ترابًا. [6]

ترجمہ: جو امام کے پیچھے قرآن مجید پڑھتا ہے کاش کہ اس کا منہ مٹی سے بھر دیا جائے۔

---

[1] مصنف عبدالرزاق ۲/ ۱٤۰۔

[2] مجمع الزوائد ومنبع الفوائد ۹/ ۲۹۰۔

[3] بخاری ۱/ ۵۳۱۔

[4] طبرانی۔ مجمع البحرین ۲/ ۱۱۹۔ طحاوی۔ ۱۲۹۔

[5] مجمع الزوائد ۲/ ۱۱۱۔

[6] طحاوی: ۱۲۹۔

5 حضرت ابوالدردا r سے منقول ہے کہ امام ہی کی قراءت مقتدی کیلئے بھی کافی ہوجائے گا۔

لااری الامام اذاام القوم الاقد کفاھم.

ترجمہ: میں سمجھتا ہوں کہ جب امام قوم کی امامت کرے تو اس کی قراءت ہی مقتدی کے لئے کافی ہوجائے گی۔

6 عن ابی جمرة قال قلت لابن عباس اقرأ والامام بین یدی فقال لا.

ترجمہ: ابوجمرہ سے مروی ہے کہ میں نے ابن عباس r سے پوچھا کہ کیا میں قرآن پڑھوں اس حال میں کہ امام میرے سامنے ہوا نہوں نے فرمایا کہ نہیں۔

7 حضرت علی r عنہ فرماتے ہیں:

من قرأ خلف الامام فقد خطأ الفطرة.

ترجمہ: جس نے امام کے پیچھے قرآن پڑھا اس نے فطرت کے خلاف کیا۔

8 حضرت سعد r عنہ فرماتے ہیں۔

وددت ان الذی یقرأ خلف الامام فی فیہ جمرة.

ترجمہ: جو امام کے پیچھے قرآن پڑھتا ہے میرا جی چاہتا ہے کہ اس کے منہ میں آگ شعلہ رکھ دوں۔

9 حضرت عمر r سے مروی ہے:

الفتح الربانی ۲/ ۱۹۹، دارقطنی ۱/ ۳۳۳، بیہقی ۲/ ۱۲۶، طحاوی: ۱۲۷۔ مسند احمد۔

طحاوی: ۱۲۹۔

احکام القرآن للجصاص ۳/ ۵۲، الجوہر النقی ۲/ ۱۵۶۔

مصنف ابن ابی شیبہ ۱/ ۳۷۶، احکام القرآن ۳/ ۵۲۔

وددت ان الذی یقرأ خلف الامام فی فیہ حجر.

ترجمہ: جو امام کے پیچھے قرآن پڑھتا ہے میرا دل چاہتا ہے کہ اس کے منہ میں پتھر رکھ دوں۔

حضرت عمر r سے یہ بھی مروی ہے کہ تمہارے لئے امام کی قراءت کافی ہے۔

حضرت سعد r سے منقول ہے:

وددت ان الذی یقرأ خلف الامام فی فیہ جمرة.

ترجمہ: میرا دل چاہتا ہے کہ امام کے پیچھے قراءت کرنے والے کے منہ میں چنگاری رکھ دوں۔

- عبداللہ ابن زید q اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ دس صحابہ۔ حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، علی، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن مسعود، زید بن ثابت، عبداللہ ابن عمر اور عبداللہ ابن عباس p سختی سے امام کے پیچھے قرآن مجید پڑھنے سے منع فرماتے تھے۔ **ینھون عن القراءة خلف الامام اشد النھی.**

موسیٰ بن عقبہ ا سے مروی ہے:

ان رسول اللہ وابوبکر وعمر وعثمان کانوا ینھون عن القراءة خلف الامام.

مصنف عبدالرزاق ۲/ ۱۳۸۔

تکفیك قراءة الامام (مصنف ابن ابی شیبہ ۱/ ۳۷۶)۔

مصنف ابن ابی شیبہ ۱/ ۳۷۶۔

عمدة القاری ۳/ ۶۷۔

مصنف عبدالرزاق ۲/ ۱۳۹۔

ترجمہ: رسول اللہ s، ابوبکر، عمر اور عثمان p امام کے پیچھے قراءت کرنے سے منع فرماتے تھے۔

q حضرت سوید بن غفلہ r سے دریافت کیا گیا کہ کیا امام کے پیچھے ظہر وعصر میں قرآن پڑھا جائے؟ فرمایا کہ نہیں۔

w روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ عہد صحابہ p میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کا عام معمول نہیں تھا چنانچہ نافع بن محمود سے مروی ہے کہ ابونعیم سورۂ فاتحہ پڑھ رہے تھے اور ان کے پیچھے حضرت عبادہ بن صامت r سورۂ فاتحہ پڑھنے لگے تو نافع نے بطور تعجب کے پوچھا:

سمعت تقرأ بام القران وابو نعیم یجھر بالقراۃ.

ترجمہ: میں نے آپ کو سورۂ فاتحہ پڑھتے ہوئے سنا حالانکہ ابونعیم جہراً قراءت کررہے تھے۔

غور فرمایا جائے کہ اگر اس زمانہ میں عام معمول امام کے پیچھے قرآن پڑھنے کا ہوتا تو سائل کے لئے یہ بات کیوں باعث حیرت ہوتی؟

عقل وقیاس:

یہ عقل وقیاس کا تقاضہ بھی ہے، اس لئے کہ جب آدمی کسی کو اپنا ترجمان اور نمائندہ بناتا ہے تو خود بولنے کے بجائے خاموش رہتا ہے اور صرف اس کا ترجمان ہی گفتگو کیا کرتے ہے۔ امام کی حیثیت جماعت کی طرف سے ترجمان ونمائندہ ہی کی ہے اس لئے مقتدی کو خاموشی اختیار کرنی چاہئے۔

مصنف ابن ابی شیبہ ۱/ ۳۷۷۔

بیھقی ۲/ ۱۶۵۔

امام کے پیچھے قرأت فاتحہ کے دلائل:

تاھم ایسا نہیں ہے کہ جن سلف صالحین کے نزدیک امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی تلاوت کی جائے گی ان کی رائے یکسر بے دلیل ہے۔ مختلف حدیثیں ہیں جو اس کی تائید میں ہیں۔ چند روایات ذکر کی جاتی ہیں:

1 ان رسول اللّٰہ قال لاصلوۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب.

ترجمہ: آپ s نے فرمایا اس شخص کی نماز نہیں جو فاتحہ نہیں پڑھے۔

اس مضمون کی روایت ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن عمرو ابن عاص r سے، مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے، ابن ماجہ وطحاوی نے حضرت عائشہ R سے اور بعض دوسرے صحابہ p سے بھی نقل کی ہے۔ یہاں تک کہ امام بخاری l نے تو اس مضمون کی روایت کے تواتر کے ساتھ منقول ہونے کا دعویٰ کیا ہے لیکن اس سے تو صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ فاتحہ نماز میں پڑھی جائے گی، یہ تو خود احناف کو بھی تسلیم ہے کہ سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب ہے لیکن یہ کہ امام کی اقتداء کرنے والے بھی سورۂ فاتحہ پڑھیں، حدیث میں اس کی صراحت نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث سے سورۂ فاتحہ کی فرضیت بھی ثابت نہیں کی جاسکتی۔

اولاً تو اس لئے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو r، حضرت ابوہریرہ r اور حضرت عائشہ R وغیرہ کی روایت میں کہا گیا ہے کہ سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز ''خداج'' ہے۔

''خداج'' کو مفہوم یہ تو نہیں ہوتا کہ کوئی شئی بالکل پائی نہ جائے بلکہ ''خداج''

بخاری ۱/ ۱۰۴، ابو داؤد ۱/ ۱۶۹، ترمذی ۱/ ۱۱۹، ابن ماجہ ۱/ ۵۷، عن عبادہ بن صامت۔

جزء القراءت ص: ٤۔

سے مراد ہے کسی چیز کا نقص کے ساتھ پایا جانا۔ فرض کو ترک کردینے کی وجہ سے صرف نقص پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ عمل درست ہی نہیں ہوتا، اسی لئے احناف نے سورۂ فاتحہ کی تلاوت کو واجب قرار دیا ہے۔ واجب سے مراد ایسے اعمال ہیں جو ضروری ہوں، ان کو ترک کرنے کی وجہ سے اس عمل میں نقص باقی رہ جاتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ عبادت اور عمل بالکل ہی رائیگاں ہو جائے، اس طرح احناف کا عمل ٹھیک ان احادیث کے مطابق ہے۔

دوسرے بعض روایات میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ قرآن مجید کے کچھ اور حصہ کے قراءت کو بھی اسی طرح قرار دیا گیا ہے، چنانچہ حضرت عبادہ ابن صامت r سے مروی ہے:

لاصلوۃ لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب فصاعدًا.

ترجمہ: اس شخص کی نماز نہیں جو سورۂ فاتحہ اور کچھ قرآن نہیں پڑھے۔

حضرت ابوہریرہ r کی روایت میں ہے:

لاصلوۃ الابقراٰنٍ ولو بفاتحة الکتاب فمازاد.

ترجمہ: قرآن کے بغیر نماز نہیں، چاہے سورۂ فاتحہ اور کچھ اور قراءت کردی جائے۔

حضرت ابوسعید خدری r سے مروی ہے:

لاصلوۃ لمن لم یقرأ بالحمد وسورة.

ترجمہ: اس کی نماز نہیں جو فاتحہ اور ایک سورت نہ پڑھے۔

اس مضمون کی روایت ابوداؤد نے حضرت ابوسعید خدری r سے اور

ابو داؤد۔ عن محمود بن ربیع۔ ١/ ١١٩۔

ابو داؤد عن عثمان نهدی۔ ١/ ١١٨۔

ترمذی ج١ ص٣٢۔

Work\Zam
o-Aitada

رفاعہ ابن رافع r سے بھی نقل کیا ہے، ان روایات میں آپ نے سورۂ فاتحہ کے ساتھ قرآن مجید کے کچھ اور حصہ کی تلاوت کا بھی ٹھیک اسی طرح حکم دیا ہے جس طرح سورۂ فاتحہ کی تلاوت کا، اسی لئے احناف نے سورۂ فاتحہ کو بھی واجب قرار دیا ہے اور اس کے ساتھ کسی سورت کی تلاوت کو بھی تاکہ تمام احادیث پر عمل ہو جائے۔

اب جو لوگ اوپر ذکر کی گئی حدیث سے سورۂ فاتحہ کا فرض ہونا ثابت کرتے ہیں، آخر ان حدیثوں کی وجہ سے قرآن کے کچھ حصہ کی قراءت کو بھی کیوں فرض نہیں کہتے اور جیسے ان احادیث سے مقتدی کے لئے سورۂ فاتحہ کی فرضیت ثابت کرتے ہیں، سورۂ فاتحہ کے علاوہ مزید قرآن پاک کی تلاوت کو ان کے حق میں کیوں فرض قرار نہیں دیتے؟ معلوم ہوا کہ یہاں ''لاصلوۃ'' (نماز نہیں ہوگی) کا حکم مقتدی کے لئے نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کے لئے ہے جن کو خدا کے رسول s نے قراءت کی اجازت دی ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو یا تو خود امام ہوں یا تنہا نماز پڑھ رہے ہوں نہ کہ مقتدی کے لئے جن کو قراءت سے منع کیا گیا ہے، نیز ''نماز نہیں ہوگی'' سے مراد یہ نہیں ہے کہ ''نماز صحیح نہیں ہوگی'' بلکہ مراد یہ ہے کہ ''نماز کامل نہ ہوگی بلکہ ناقص ہوگی'' جیسا کہ رسول s نے ارشاد فرمایا **لا صلوۃ لجار المسجد الا فی المسجد** (مسجد کے پڑوسی کی نماز نہیں ہوگی مگر مسجد ہی میں) یہاں بھی ٹھیک وہی ''لاصلوۃ'' فرمایا گیا ہے اور بالاتفاق اس سے یہی مراد ہے کہ نماز کامل نہ ہوگی نہ یہ کہ نماز صحیح نہیں ہوگی۔

2 من صلی صلوۃ لم یقرأ فیھا بام القراٰن فھی خداج ثلاثًا غیر تمام فقیل لابی ھریرۃ انا نکون وراء الامام فقال اقرأ بھا فی نفسک.

ترجمہ: جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اور نماز پڑھے اس کی نماز ناقص ہے اور ناتمام۔

مسلم، ١/ ١٦٩ ابو داؤد، ١/ ١١٩ ابن ماجہ: ٦٠۔ عن ابی ہریرۃ r۔

تین بار فرمایا گیا۔ حضرت ابو ہریرہ r سے کہا گیا کہ ہم لوگ امام کے پیچھے ہوتے ہیں، فرمایا: دل ہی دل میں پڑھو۔

اس حدیث میں ''قراء ت فی النفس'' سے ضروری نہیں کہ آہستہ پڑھنا مراد ہو بلکہ غالباً دل ہی دل میں پڑھنا مراد ہے جس میں زبان پر الفاظ نہ ہو سکے، بہت سے مواقع پر ایسا ہوتا ہے کہ زبان و ہونٹ میں کوئی حرکت نہیں ہوتی لیکن آدمی دل ہی دل میں ایک بات کہتا رہتا ہے۔ ''فی النفس'' کا لفظ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ جیسے حضرت عثمان بن ابی العاص کی روایت میں ہے کہ حضور s نے مجھے اپنی قوم کا امام مقرر کیا تو میں نے آپ s سے عرض کیا:

انی اجد فی نفسی شیئاً۔

ترجمہ: میں اپنے دل میں کچھ پاتا ہوں۔

''فی النفس'' کے معنی دل ہی دل میں غور و تدبر کرکے بھی ہیں، آیت قرآنی ''واسرھا یوسف فی نفسه'' (یوسف: ۷۷) میں بھی یہی معنی مراد ہیں۔

چنانچہ فقہاء مالکیہ میں عیسیٰ اور ابن نافع سے منقول ہے کہ اس قلب پر اجراء قرآن مقصود ہے ولعله اراد اجراء ھا علیٰ قلبه دون ان یقرأھا بلسانه۔

3 کنا خلف النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم فی صلوة الفجر فثقلت علیه القراء ة فلما فرغ قال لعلّکم تقرؤن خلف امامکم قلنا نعم ھکذا یا رسول اللّٰہ قال لا تفعلوا الا بفاتحة الکتاب فانه لاصلوة لمن لم یقرأبھا۔

ترجمہ: ہم لوگ نماز فجر میں حضور s کے پیچھے تھے، آپ s پر قرأت

مشکوۃ المصابیح، باب ماعلی الامام، الفصل الثالث۔

زرقانی ۱/ ۱۷۶۔

ابو داؤد، ترمذی، عن عبادہ بن صامت۔

First Proof	15-06-09
Second Proof	05-08-09
FINAL	00-00-00
TOTAL-PAGE	

مشکل ہوگئی، پھر جب آپ s فارغ ہوئے تو فرمایا: شاید تم امام کے پیچھے قرآن پڑھتے ہو؟ ہم نے کہا ہاں ایسا ہی ہے اللہ کے رسول! آپ s نے فرمایا: صرف سورۂ فاتحہ پڑھا کرو، اس لئے کہ اس کی نماز نہیں جس نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی۔

جو لوگ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے قائل ہیں، یہی حدیث ان کی سب سے صریح اور واضح دلیل ہے، کاش کہ یہ جس قدر صریح ہے اسی قدر صحیح بھی ہوتی مگر ایسا نہیں ہے، اس روایت کی سند میں متعدد ایسے سقم پیدا ہوگئے ہیں کہ اس سے استدلال کیا جانا صحیح نہیں ہے۔

اول اس کے سلسلۂ سند میں محمد بن اسحاق ہیں، جن کی روایتیں فقہی احکام سے متعلق حدیثوں میں معتبر نہیں مانی جاتیں دوسرے اس کی سند میں اضطراب ہے جو اہل فن کے نزدیک روایت کو مجروح کردیتا ہے۔ پھر اس میں ''مکحول'' نامی راوی نے ''عن'' کے ساتھ روایت نقل کی ہے حالانکہ وہ مدلّس ہے اور مدلّس کی روایت ''عن'' کے ساتھ مشکوک ہوتی ہے۔

4 حضرت ابو عبادہ r کی روایت الفاظ کے فرق کے ساتھ مختلف لوگوں نے نقل کی ہے، چنانچہ نسائی اور ابو داؤد کی ایک اور روایت کے الفاظ اس طرح ہیں:

فلا تقرء وا بشئیٍ من القراٰن اذا جھرتُ الا باُمّ القراٰن۔

ترجمہ: جب میں زور سے قرآن پڑھوں تو سورۂ فاتحہ کے سوا اور کچھ نہ پڑھو۔

اس روایت کے سلسلۂ سند میں ایک راوی ''نافع بن محمود بن ربیع'' جن کا معتبر اور غیر معتبر ہونا معلوم نہیں، چنانچہ خود حافظ ابن حجر جو قرأت فاتحہ خلف الامام کے قائل ہیں) نے نافع کو ''مستور'' مانا ہے۔

فتح الملھم ج۲ ص۲۶ ابن حجر الدرایۂ کتابُ الحج۔

آثار السنن ۱/ ۷۶۔

دیکھئے تقریب التہذیب/ ۵۵۸۔

5 ان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم لما قضى صلوته اقبل عليهم بوجهه فقال أتقرؤن فى صلوتكم والا مام يقرأ فسكتوا فقال ثلاث مراتٍ فقال قائل اؤقائلون انا لنفعل قال فلا تفعلوا ليقرأ احدكم بفاتحة الكتاب فى نفسهٖ.

ترجمہ: آپ s نے صحابہ p کو نماز پڑھائی پھر آپ s نے نماز مکمل کرلی تو ان کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: کیا تم لوگ امام کے پیچھے قرآن پڑھتے ہو حالانکہ امام قراءت کرتا رہتا ہے، صحابہ خاموش رہے، آپ s نے تین دفعہ یہی بات فرمائی، پھر ایک کہنے والے نے عرض کیا: ہم لوگ ایسا کرتے ہیں، آپ نے فرمایا ایسا نہ کرو، چاہیئے کہ تم صرف دل ہی دل میں سورۂ فاتحہ پڑھا کرو۔

اس روایت میں بھی اولاً تو "قراء ت فاتحه فى النفس" کا حکم دیا گیا ہے اور حضرت ابوہریرہ r کی روایت میں گذر چکا ہے کہ اس سے کیا مراد ہے؟
نیز امام بیہقی نے اس روایت کو "غیر محفوظ" قرار دیا ہے۔

6 قال النبى صلى اللّٰه عليه وسلم لعلكم تقرؤن والامام يقرأ مرتين اوثلاثًا قالوا يارسول اللّٰه انا لنفعل قال لا تفعلوا الا ان يقرأ احدكم بفاتحة الكتاب.

ترجمہ: آپ s نے دو یا تین بار فرمایا: شاید تم لوگ امام کے پیچھے قرأت کرتے ہو لوگوں نے عرض کیا، ہم لوگ ایسا کرتے ہیں، آپ s نے فرمایا ایسا نہ

بیہقی ۲/ ۱٦٦ عن ابی قلابة عن انس r۔
سنن کبریٰ ۲/ ۱٦۹۔
الفتح الربانی ۳/ ۱۹۸۔

کرو، سوائے اس کے تم سورۂ فاتحہ پڑھو۔
ابن حجر نے اس حدیث کو "حسن" قرار دیا ہے لیکن بعض اہل علم کو اس کی صحت میں کلام ہے۔

7 اذا اقرأ الامام بأم القراٰن فاقرأ بها واسبقه فانه اذا قال ولا الضالين قالت الملئكة اٰمين من وافق ذلك قمن ان يستجاب بهم.

ترجمہ: امام سورۂ فاتحہ پڑھے تو تم بھی پڑھو اور امام سے پہلے پڑھ لیا کرو، اسلئے کہ جب وہ والضالین کہتا ہے تو فرشتے آمین کہتے ہیں، پس جس کی دعا اس کے موافق ہوا امید ہے کہ ان کی دعا قبول کرلی جائے۔

یہ حدیث سند کے اعتبار سے قابل قبول ہے لیکن اس حدیث کا مضمون "اسبقه" کہ قرأت میں امام سے سبقت کرو، حدیث "انما جعل الامام ليؤتم به" (امام اس لئے ہے کہ اس کی پیروی کی جائے) اور اسلام کی مجموعی تعلیم جس میں امام کی اتباع کو ضروری قرار دیا گیا ہے اور اس پر سبقت کرنے کو شدت سے منع کیا گیا ہے، کے خلاف ہے................ اس ٹکراؤ اور تعارض نے اس کی صحت اور استناد کو ایک گونہ مشتبہ کردیا ہے۔

8 قال رسول اللّٰه من صلى صلوة مكتوبة مع الامام فليقرأ بفاتحة الكتاب فى سكتاته.

ترجمہ: آپ s نے فرمایا جو امام کے ساتھ فرض نماز ادا کرے، اسے سکتوں میں سورۂ فاتحہ پڑھ لینی چاہیئے۔

آثار السنن: ۱/ ۸۱۔
بخاری عن ابی هريرة r فی جزء القراءة۔
مستدرك حاكم عن ابی هريرة r۔

اس میں ایک راوی محمد بن عبداللہ لیثی ہیں، جن کو ابن معین، دارقطنی، امام بخاری اورامام نسائی ا نے ضعیف قرار دیا ہے۔

آثارِ صحابہ :p

امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی قراءت سے متعلق آثار صحابہ p بھی ہیں، امام بخاری نے ''جزوقرأت الفاتحہ خلف الامام'' میں ایسے اکثر اثار کو جمع کر دیا ہے۔

1 عبداللہ بن عمر r سے امام کے پیچھے قراءت کے بارے میں استفسار کیا گیا تو فرمایا:

ما کانو یرون بأسًا ان یقرأ بفاتحة الکتاب.

ترجمہ: لوگ سورۂ فاتحہ پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔

اس کی سند میں یحییٰ بن بکاء ہیں جو ضعیف ہیں۔

2 حضرت عمر r سے دریافت کیا گیا کہ امام کے پیچھے قرآن پڑھوں؟ تو فرمایا: ہاں دریافت کیا گیا چاہے آپ خود قرآن پڑھ رہے ہوں؟ فرمایا ''ہاں'' چاہے میں خود قرآن پڑھ رہا ہوں۔

اس روایت میں ایک راوی ''جواب تیمی'' ہیں جن کو بعض نے معتبر اور بعض نے غیر معتبر قرار دیا ہے، ابن حجر ا نے ان کے بارے میں لکھا ہے: **صدوق رمی بالارجاء** نیز اس سے صرف سورۂ فاتحہ ہی کا پڑھنا معلوم نہیں ہوتا بلکہ امام کے پیچھے مطلقاً قرآن پڑھنے کا جواز معلوم ہوتا ہے، حالانکہ غیر مقلد حضرات بھی اس کے قائل نہیں ہیں۔

بخاری فی الجزء عن یحییٰ ا لبکاء۔

تقریب التہذیب ۳/ ۵۵۔

طحاوی ۲۹ او دارقطنی۔

تقریب التہذیب: ۱۴۳۔

3 عن ابی کعب انه کان یقرأ خلف الامام.

ترجمہ: حضرت ابی کعب r امام کے پیچھے قرآن پڑھتے تھے۔

اس کی سند میں زیاد ''بکائی'' ہیں جو حدیث کی روایت میں کمزور سمجھے گئے ہیں۔

4 عن علی بن ابی طالب انه کان یأمرویحب ان یقرأ خلف الامام فی الظهر والعصر بفاتحة الکتاب وسورة و فی الاخریین بفاتحة الکتاب.

ترجمہ: حضرت علی r حکم دیتے تھے اور پسند کرتے تھے کہ ظہر اور عصر میں امام کے پیچھے پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور کوئی سورت اور اخیر کی رکعتوں میں صرف سورۂ فاتحہ پڑھی جائے۔

اس سے اولاً تو صرف سری نمازوں میں مقتدی کا قرآن پڑھنا معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے سورۂ فاتحہ کے علاوہ دوسری سورت ملانے کا جواز بھی معلوم ہوتا ہے ظاہر ہے ہمارے سلفی بھائی بھی ان باتوں کے قائل نہیں ہیں۔ تیسرے اس روایت کو سفیان ابن حصین نے زہری سے نقل کیا ہے اور امام احمد کی رائے ہے کہ سفیان کی روایت زہری سے معتبر نہیں۔

5 عن ابی مریم سمعت ابن مسعود یقرأ خلف الامام.

ترجمہ: ابومریم کہتے ہیں: میں نے ابن مسعود r کو امام کے پیچھے قرآن پڑھتے ہوئے سنا ہے۔

بخاری فی جزء القراءۃ۔

دارقطنی وبخاری فی جزء م۔

دیکھئے التعلیق الحسن: ۸۳۔

بخاری فی جزء م۔

اس روایت کو شریک نے اشعت بن ابی شعشاء سے نقل کیا ہے حالانکہ شریک کا اشعث سے سماع ثابت نہیں ہے۔

6 عن جابر بن عبداللّٰه قال کنا نقرأ فی الظهر والعصر خلف الامام فی الرکعتین الاولین بفاتحة الکتاب.

ترجمہ: حضرت جابر r سے مروی ہے کہ ہم ظہر وعصر میں امام کے پیچھے پہلی دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ پڑھا کرتے تھے۔

اس کی سند میں ایک راوی ''سعید بن عامر'' ہیں، جن کو بعض محققین نے نامعتبر سمجھا ہے۔ دوسرے اس سے بھی صرف سری نماز ہی میں امام کے پیچھے قرأت ثابت ہوتی ہے۔ تیسرے مؤطا امام مالک I میں حضرت جابر بن عبداللہ سے بسند صحیح اس کے متعارض روایت منقول ہے۔

7 عن ابن عباس قال اقرأ خلف الامام بفاتحة الکتاب فی الظهر والعصر.

ترجمہ: ابن عباس q سے روایت ہے انہوں نے فرمایا ظہر وعصر میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھا کرو۔

اس سے بھی صرف سری نمازوں ہی میں قراءت ثابت ہوتی ہے۔

دیکھئے التعلیق الحسن: ۸۳۔

ابن ماجه ۱/ ۶۱۔

دیکھئے مؤطا امام مالك مع الزرقانی ۱/ ۱۷۵۔

طحاوی۔ ۱۲۱۔ باب القرأة فی الظهر والعصر۔

خلاصۂ بحث:

حاصل یہ ہے کہ:

1 احادیث اور صحابہ p کے آثار کثرت سے احناف کے مسلک کی تائید کرتے ہیں، قرآن مجید تو گویا ان کی رائے پر ناطق ہے اور قیاس بھی انہیں کا مؤید ہے۔

2 امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے سلسلے میں جو روایات نقل کی جاتی ہیں وہ یا تو صراحتاً امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے وجوب کو بتاتی نہیں ہیں اور بتاتی ہیں تو ان کی سند عموماً کمزوری سے خالی نہیں ہے۔

3 تاہم اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے لئے کوئی دلیل ہی نہیں ہے اور یہ بالکل بے اصل ہے جب کہ بعض صحابہ p سے بھی اس کے مطابق عمل منقول ہے۔

4 اسی طرح احناف کی طرف سے میں نے جو روایات وآثار پیش کئے ہیں وہ عموماً صحیح اور قوی سندوں سے ثابت ہیں تاہم ان میں بعض روایات ضعیف بھی ہیں جو محض تقویت کے لئے ذکر کردی گئی ہیں۔ (واللہ اعلم)

[ ]

آمین زور سے کہا جائے یا آہستہ؟

’’آمین‘‘ ایک دعائیہ لفظ ہے، جس کے معنی ہیں ’’بارالہا‘‘! اس دعا کو قبول فرمالیجئے (**اللّٰهم استجب لی**).

سورۂ فاتحہ کا آخری جز ودعائیہ ہے جس میں سیدھی راہ کی ہدایت اور معتوب و گمراہ قوموں کی کجروی وانحراف سے اجتناب کی توفیق کی دعا کی گئی ہے، اس پر آمین کون کہے اور کس طرح کہے؟ اس میں اہل علم کی رائیں مختلف ہیں، امام مالک ا کے مشہور قول کے مطابق امام آمین نہ کہے گا بلکہ صرف مقتدی آمین کہیں گے دوسرے فقہاء کے نزدیک امام ومقتدی دونوں آمین کہیں گے، امام ابوحنیفہ کے نزدیک آمین آہستہ کہی جائے گی، یہی رائے مالکیہ کی بھی ہے امام احمد ا کا خیال ہے کہ آمین زور سے کہی جائے امام شافعی ا کا قول جدید امام ابوحنیفہ ا کی رائے کے مطابق ہے اور قدیم رائے امام احمد ا کی رائے کے موافق جس پر فقہ شافعی میں فتویٰ ہے۔

امام مالک ا سے بھی دونوں طرح کے اقوال منقول ہیں، البتہ عمل زور

النهاية لابن اثير: ١/ ٧٢۔
شرح الزرقانی علی المؤطا: ١/ ١٨٠۔
الشرح الصغير: ٢/ ٣٦٧۔
المغنی: ١/ ٢٩٠۔
المهذب مع شرح: ٣/ ٣٦٨۔

ہی سے آمین کہنے پر ہے۔

بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو آمین کے زور سے یا آہستہ کہے جانے کے سلسلے میں چند طرح کی روایات ہیں، جو کچھ وہ ہیں جو صراحتاً آمین کو زور سے کہے جانے کو بتاتی ہیں۔ بعض احادیث وآثار سے صراحتہً معلوم ہوتا ہے کہ آپ s کا اور صحابہ p کا معمول آہستہ آمین کہنے کا تھا، اسی طرح بعض احادیث سے اشارتاً آمین کا زور سے کہنا اور بعض سے آہستہ کہنا معلوم ہوتا ہے۔

جہر کی روایتیں:

وہ حدیثیں جو آمین میں جہر کو بتاتی ہیں، حسب ذیل ہیں:

1 كان رسول اللّٰه اذ اقرأ ولاالضالين قال اٰمين رفع بها صوته.

ترجمہ: رسول s جب ولا الضالین پڑھتے تو بہ آواز بلند آمین کہتے۔

یہ وہی حضرت وائل r کی روایت ہے جس میں شعبہ اور سفیان ثوری ا میں اختلاف ہوا ہے جیسا کہ مذکورہ ہوگا۔ شعبہ نے وائل بن حجر r سے جو روایت نقل کی ہے اس کے الفاظ میں: **اخفی به صوته** (آمین پست آواز میں کہا) طبرانی اور بیہقی نے نقل کیا ہے کہ ’’**ولا الضالين**‘‘ کے بعد آپ نے فرمایا **رب اغفرلی، اٰمين** اور طبرانی کی روایت میں ہے کہ آپ نے تین بار آمین کہا۔ **قال اٰمين ثلاث مراتٍ** بخاری ومسلم خود بھی جہر کے ساتھ آمین کے قائل ہیں۔ اور اس رائے کے ناصر ومددگار ہیں لیکن اس کے باوجود شاید اسی

الميزان الكبرىٰ للشعرانی: ١/ ١٦٨۔ رحمة الامة ص: ٤٢۔ اوجز المسالك: ١/ ٢٥۔
ابو داؤد: ١/ ١٣٤۔ ومد بهاصوته، ترمذی ١/ ٥٧ وغيره عن وائل بن حجر r۔
بیهقی: ٢/ ١٥٨۔
دیکھئے مجمع الزوائد ٢/ ١١٢ آثارالسنن والتعليق الحسن: ١/ ٩٣۔

اضطراب کے پیش نظر اپنی صحیحین میں اس حدیث کی تخریج نہیں کی ہے۔

پھر غور کرو کہ سفیان اس روایت کے راوی ہیں اور خود ان کا مسلک آمین آہستہ کہنے کا ہے نہ کہ زور سے کہنے کا، جب راوی خود روایت پر عمل نہ کرے تو یقیناً یہ بات اس روایت کے قبول واستناد اور اعتبار واعتماد کو مجروح کر دیتی ہے۔

2 کان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم اذا فرغ من قراء ة ام القراٰن رفع صوته وقال اٰمین 🗀

ترجمہ: آپ s جب سورۂ فاتحہ کی قرأت سے فارغ ہوجاتے تو بہ آواز بلند آمین کہتے۔

دارقطنی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے اور حاکم نے تو اس کو صحیحین کی سطح کی روایت قرار دیا ہے لیکن محققین کو اس سے اتفاق نہیں ہے کیونکہ اس روایت کی سند میں یحییٰ بن عثمان نے اسحاق سے روایت کی ہے اور یحییٰ متکلم فیہ راوی ہیں اور اسحاق بن ابراہیم بن علاء زبیدی بھی ایسے راوی ہیں جن کو عام طور پر محدثین نے قبول نہیں کیا ہے۔ امام نسائی اور امام ابوداؤد نے ضعیف قرار دیا ہے، یہاں تک کہ محدث حمص ''محمد بن عون طائی'' نے کاذب وجھوٹا بتایا ہے دوسرے خود امام دارقطنی نے اپنی کتاب العلل میں اعتراف کیا ہے کہ اس روایت کی مختلف سندوں کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت کے اصل الفاظ اس طرح ہیں: **اذا من الامام فامنوا** جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو 🗎 ظاہر ہے کہ اگر روایت کے صحیح الفاظ اس طرح ہوں تو جہر کے لئے یہ حدیث صریح باقی نہیں رہے گی۔

3 عن ابی هريرة رضی اللّٰه عنه قال ترک الناس

🗀 دارقطنی: ۱/ ۳۳۵۔ مستدرک حاکم، البیهقی: ۵۸/۲ عن ابی هريرة ۲۔

🗎 الجوهر النقی: ۲/ ۵۶، آثارالسنن والتعليق الحسن: ۱/ ۹۳۔

التامين وكان رسول الله اذا قال غير المغضوب عليهم ولا الضالين قال اٰمين حتى يسمع اهل الصف الاول فير تج بها المسجد 🗀

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ r سے مروی ہے کہ آپ s نے کہا: لوگوں نے آمین کہنا چھوڑ دیا ہے، حالانکہ رسول اللہ s جب ''**غیر المغضوب علیهم ولا الضالین**'' کہتے تو آمین کہتے، یہاں تک کہ پہلی صف کے لوگ سن لیتے اور مسجد گونج جاتی۔

اگر یہ حدیث صحیح ہوتی تو شاید اس مسئلہ میں برہان قاطع ہوتی مگر افسوس کہ یہ بھی ضعف سے خالی نہیں، اس لئے کہ اس میں ایک راوی بشر بن رافع ہیں جو اکثر محدثین کے نزدیک ضعیف ہیں، امام بخاری، ابن معین اور حافظ ابن حجر وغیرہ نے ان کے ضعف کی صراحت کی ہے، ابن عبدالبر نے ان کو منکر حدیث قرار دیا ہے، اور ابن حبان کو تو ان پر وضع حدیث کا بھی شبہ ہے، نیز مسند ابویعلیٰ اور سنن ابوداؤد میں انہیں ''بشر بن رافع'' سے یہ روایت منقول ہے لیکن اس میں **یرتج بها المسجد** (آمین کی آواز سے مسجد گونج جاتی تھی) کے الفاظ نہیں ہیں، اس لئے ان الفاظ کی صحت بھی مشتبہ ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی ابوعبداللہ آئے ہیں جو مجہول ہیں۔ 🗎

4 عن ام الحصين انها كانت تصلی خلف النبی صلی اللّٰه عليه وسلم فی صف النساء فسمعته يقول (الحمد لله رب العالمين الرحمٰن الرحيم مالك يوم الدين) حتى بلغ غير المغضوب عليهم ولا الضالين

🗀 ابن ماجه ص: ٦١۔

🗎 دیکھئے:۔تحقیق الدکتور مصطفی اعظمی علیٰ ابن ماجه ۱/ ۱۵۳۔

قال آمين حتى سمعته وهى فى صف النساء.

ترجمہ: حضرت ام حصین R سے مروی ہے کہ انہوں نے آپ s کے پیچھے عورتوں کی صف میں نماز ادا کی، انہوں نے آپ s کو (الحمد للہ رب العالمین، الرحمٰن الرحیم، مالک یوم الدین) کہتے سنا، یہاں تک کہ جب آپ s **غیر المغضوب علیهم و لا الضالین** پر پہنچے تو آمین کہا، یہاں تک کہ انہوں نے بھی سنا حالانکہ وہ عورتوں کی صف میں تھیں۔

اس روایت کے سلسلۂ سند میں "اسماعیل بن مسلم مکی" ہیں، علامہ ہیثمی ا نے لکھا ہے کہ وہ ضعیف ہیں۔

5 ان رسول اللّٰه قال اذا امن الامام فامنوا فانه من وافق تامينه بتامين الملائكة غفر له ماتقدم من ذنبه.

ترجمہ: آپ s نے فرمایا جب امام امین کہے تو تم بھی آمین کہو، اس لئے جس کا آمین کہنا فرشتوں کے آمین کے موافق ہو جائے اس کے گذشتہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

اس حدیث میں کہا گیا ہے کہ جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو، اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ امام بہ آواز بلند آمین کہے اور تم بھی اس کے جواب میں آمین کہو، یہ حدیث آمین کے بالجہر ہونے پر صریح نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ امام کب آمین کہتا ہے؟ امام کا بلند آواز میں آمین کہنا ضروری نہیں، بلکہ سورۂ فاتحہ کی تکمیل خود اس بات کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے کہ اب امام آمین کہہ رہا ہے، لہٰذا اس وقت مقتدی کو بھی آمین کہنا چاہئے۔

طبرانی فی الکبیر بواسطه مجمع الزوائد: ۱/ ۱۱۳-۱۱۴-

مجمع الزاوئد: ۲/ ۱۱۴-

بخاری: ۱/ ۱۰۸ عن ابی هريرة r-

دوسرے اس حدیث سے زیادہ سے زیادہ صرف امام کے لئے جہر کے ساتھ آمین کا ثبوت ملتا ہے، مقتدیوں کے لئے نہیں۔

6 عن بلال انه قال یارسول اللّٰه لا تسبقنی بآمين.

ترجمہ: حضرت بلال r سے مروی ہے انہوں نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول! آمین کہنے میں آگے نہ بڑھ جایئے۔

اس روایت کو ابوعثمان نہدی نے حضرت بلال r سے نقل کیا ہے حالانکہ ابوعثمان کی حضرت بلال r سے ملاقات ہی ثابت نہیں ہے، بیہقی نے نقل کیا ہے کہ ابوعثمان r نے اس روایت کو سلمان سے اور سلمان نے حضرت بلال r سے روایت کیا ہے لیکن خود بیہقی نے اعتراف کیا ہے کہ سلمان ضعیف اور نا قابل اعتبار ہیں۔

آہستہ کہنے کی روایتیں:

وہ احادیث وآثار جو آمین کے آہستہ کہے جانے کو بتاتی ہیں اس طرح ھیں:

1 صلى بنا رسول اللّٰه فلما قرأ غير المغضوب عليهم و لا الضالين قال آمين، وخفض بها صوته.

ترجمہ: رسول اللہ s نے ہم کو نماز پڑھائی، جب **غیر المغضوب علیهم و لا الضالین** پڑھا تو آہستہ سے آمین کہا۔

ہر چند کہ سند کے اعتبار سے یہ صحیح حدیث ہے لیکن اس حدیث کی الفاظ میں اضطراب ہے، تاہم چوں کہ یہ حدیث ہی زیادہ تر اس مسئلہ میں مدار بحث ہے اس لئے ہم اس پر گفتگو کریں گے۔

ابو داؤد: ۱/ ۱۳۴ عن ابی عثمان۔

ترمذی: ۱/ ۵۸، مسند احمد (الفتح الربانی ۳/ ۲۰۵) مسند طیالسی، دارقطنی، مستدرك حاكم عن وائل بن حجر۔

2 كان رسول الله يعلمنا يقول لا تبادروا لا اذا كبر فكبرو او اذا قال ولا الضالين فقولوا اٰمين

ترجمہ: رسول اللہ s ہمیں تعلیم دیتے تو فرماتے کہ امام سے آگے نہ بڑھ جاؤ جب وہ اللہ اکبر کہے تو اللہ اکبر کہو اور جب **ولا الضالين** کہے تو آمین کہو۔

اس حدیث سے صراحۃً تو آمین کا آہستہ کہنا معلوم ہوتا ہے، البتہ اس ہدایت میں کہ جب امام "**ولا الضالين**" کہے تو تم آمین کہو، اس بات کی طرف بھی اشارہ موجود ہے کہ امام "آمین" کے لفظ آہستہ ادا کرے گا۔

3 ان سمرة بن جندب وعمران بن حصين تذاكرا فحدث سمرة بن جندب انه حفظ عن رسول الله صلى الله عليه وسلم سكتتين، سكتة اذا كبر وسكتةاذا فرغ من قراءة غير المغضوب عليهم ولاالضالين فحفظ سمرة وانكر عليه عمران فكتب فى ذلك الى ابى بن كعب فكان فى كتابه اليهما اوفى ردہ عليهما ان سمرة قد حفظ.

ترجمہ: حضرت سمرہ بن جندب r اور عمران بن حصین r کی باہم گفتگو ہوئی تو سمرہ r نے نقل کیا کہ انہوں نے آپ s سے دو(۲) سکتے" یاد کئے ہیں، ایک وقفہ جب اللہ اکبر کہتے اور دوسرا جب آپ s "**غير المغضوب عليهم ولا الضالين**" سے فارغ ہوتے، حضرت عمران بن حصین r نے اس سے انکار کیا تو دونوں نے حضرت ابی بن کعب

مسلم عن ابی ہریرۃ ۱/ ۱۷۶۔

ابو داؤد عن حسن ۱/ ۱۱۳۔

r کو اس کی تحقیق کے لئے خط لکھا، حضرت ابی بن کعب r نے جواب دیا کہ سمرہ r کی یادداشت درست ہے۔

اس میں **ولا الضالين** کے بعد وقفہ اور بالجہر قراءت سے خاموشی اس بات کی علامت ہے کہ آپ s آمین آہستہ کہا کرتے تھے۔ اس روایت کو سمرہ بن جندب r سے حسن اور حسن سے مختلف راوی نقل کرتے ہیں، قتادہ نے مذکورہ تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرا سکتہ **ولا الضالين** کے بعد ہوا کرتا تھا لیکن یونس بن عبید اور اشعب بن عبدالملک نے بھی اس روایت کو حسن سے نقل کیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسرا سکتہ رکوع سے پہلے ہوا کرتا تھا نہ کہ سورۂ فاتحہ کے بعد، اس لئے بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس روایت کے نقل کرنے میں قتادہ سے وہم ہو گیا ہے

4 كان عمرو على لا يجهران بسم الله الرحمن الرحيم ولا بالتعوذ ولا باٰمين.

ترجمہ: حضرت عمرو، علی q، **بسم الله**، **اعوذُ بالله** اور آمین زور سے نہیں کہتے تھے۔

یہ مضبوط اور قوی دلیل ہوتی مگر افسوس کہ یہ بھی ضعف سے خالی نہیں اس میں ایک راوی ابوسعید ہیں جن کو اکثر ناقدین حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے۔

5 ان رسول الله قال اذا قال الامام غير المغضوب عليهم ولاالضالين فقولوا اٰمين فانه من وافق قوله قول الملائكة غفر له ماتقدم من ذنبه.

ملاحظہ ہو: سنن ابوداؤد ج۱، باب السكتة عندالافتتاح۔ص: ۱۸۳۔

طحاوی عن ابی وائل ص: ۱۲۔

بخاری عن ابی ہریرۃ ۱/ ۱۰۳، نسائی ۱/۱۴۷، دارمی ۱/ ۲۲۸۔

ترجمہ: آپ s نے فرمایا کہ جب امام "**غیر المغضوب علیھم ولا الضالین**" کہے تو آمین کہو کہ جس کی آمین فرشتوں کے موافق ہو جائے اس کے گذشتہ تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

یہاں بھی امام کے آمین کہنے کا ذکر نہیں، گویا اس نے آمین آہستہ کہا ہوگا۔

6 عن ابی موسیٰ الا شعری قال ان رسول اللّٰہ خطبنا فبین لنا سنتنا وعلمنا صلاتنا فقال اذا صلیتم فاقیموا صفوفکم ثم لیؤمکم احدکم فاذا کبر فکبرو او اذا قال غیر المغضوب علیھم ولاالضالین فقولوا اٰمین یحبکم اللّٰہ. 🗁

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعری r سے روایت ہے کہ رسول اللہ s نے خطبہ دیا، ہمارے لئے ہمارا طریق واضح فرمایا اور نماز کی تعلیم دی، چنانچہ فرمایا جب نماز پڑھو تو صفوں کو درست کر لو پھر تم میں کوئی امامت کرے، جب امام **اللّٰہ اکبر** کہے تو **اللّٰہ اکبر** کہو اور جب "**غیر المغضوب علیھم ولا الضالین**" کہے تو آمین کہو، اللہ تعالیٰ تمہاری دعا قبول فرمائیں گے۔

وائل بن حجر r کی روایت:

اس باب میں فریقین کی طرف سے سب سے صحیح اور صریح روایت حضرت وائل بن حجر کی ہے، جن سے سفیان نے صراحۃً جہر کے ساتھ آمین کہنا نقل کیا ہے اور شعبہ نے صراحۃً آہستہ کہنا نقل کیا ہے۔

جو اہل علم آمین بالجہر کے قائل ہیں انہوں نے ترجیح کی راہ اختیار کی اور سفیان کی روایت کو ترجیح دی ہے اور اس کے لئے درج ذیل وجوہ بتائے ہیں:

🗁 مسلم: ۱۷٤/۱۔ باب التشهد فی الصلوٰۃ۔

1 اول یہ کہ شعبہ نے اس روایت کو نقل کرنے میں متعدد غلطی کی ہے، چنانچہ حجر کو "ابوالعنبس" (عنبس کا باپ) قرار دیا ہے، حالانکہ وہ ابن العنبس (عنبس کے بیٹے) اور ابوالسکن (سکن کے باپ) ہیں۔ 1 اس روایت کو حجر بن عنبس نے براہ راست وائل بن حجر ا سے نقل کیا ہے، جب کہ "شعبہ" نے حجر بن عنبس اور وائل بن حجر ا کی درمیان علقمہ بن وائل ا کو واسطہ بنایا ہے۔ 2 حضرت وائل ا کے الفاظ ہیں: **قال اٰمین ومدبھا صوتہٗ** (اپنی آواز کھینچی) اور شعبہ نے نقل کر دیا ہے **خفض بھا صوتہٗ** (اپنی آواز پست رکھی)۔

2 دوم یہ کہ سفیان اہل فن کے نزدیک شعبہ سے زیادہ ثقہ اور قابل قبول ہیں۔ چنانچہ امام بیہقی نے کہا ہے کہ اہل علم کے نزدیک اس بات میں میرے علم کے مطابق کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اگر سفیان اور شعبہ کی روایت میں باہم ٹکراؤ پیدا ہو جائے تو سفیان کی روایت کو ترجیح دی جائے گی۔

3 تیسرے خود شعبہ نے اعتراف کیا ہے کہ سفیان مجھ سے زیادہ قوی الحفظ ہیں، **سفیان احفظ منی.**

4 چوتھے شعبہ کی روایت کے مطابق اس حدیث کو علقمہ بن وائل نے اپنے والد وائل بن حجر سے نقل کیا ہے حالانکہ علقمہ چھ ماہ کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور ان کو اپنے والد سے کچھ سننے کا موقع ہی نہ مل سکا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کسی بھی اعتراض میں وزن نہیں ہے عربوں میں یہ بات عام تھی کہ دادا پوتے کا ایک ہی نام ہوا کرتا تھا، حجر کے والد کا نام بھی عنبس تھا اور لڑکے کا بھی، اس طرح وہ ابوالعنبس بھی ہیں اور ابن العنبس بھی، عنبس کے ایک اور بھائی ہیں، ان کا نام "سکن" ہے، اس طرح دو لڑکوں کی طرح نسبت کرتے ہوئے کنیت ابوالعنبس بھی تھی اور ابوالسکن بھی، خود ابن حبان نے کتاب الثقات میں

اس کی تصریح کی ہے اور کہا ہے:۔ "حجر ابن العنبس ابو السکن الکوفی وھو الذی یقال له حجر ابو العنبس" نیز جس طرح شعبہ نے "ابوالعنبس" کے لفظ سے نام ذکر کیا ہے اسی طرح ابوداؤد کی روایت میں محمد بن کثیر اور دارقطنی کی روایت میں وکیع اور محاربی نے سفیان سے بھی ابن العنبس ہی کے الفاظ نقل کئے ہیں اور کہا ہے کہ وہ ابوالعنبس بھی ہیں اور ابوالعنبس بھی۔

جہاں تک علقمہ کے واسطے کی بات ہے تو اہل علم اس بات سے واقف ہیں کہ روایت میں اگر ایک ہی شخص سے راوی نے براہ راست بھی حدیث سنی ہو اور اس حدیث کو کسی اور کے واسطے سے بھی سنی ہو تو حدیث بیان کرتے ہوئے کبھی اس واسطے کا ذکر کیا جاتا ہے اور کبھی نہیں کیا جاتا ہے، شعبہ تک چوں کہ دونوں طرح یہ روایت پہنچی تھی اس لئے انہوں نے علقمہ کا واسطہ بھی ذکر کر دیا، چنانچہ مسند احمد اور مسند ابوداؤد وطیالسی میں صراحت موجود ہے کہ شعبہ نے سلمہ بن کہیل سے نقل کیا کہ حجر نے ان کو بتایا کہ میں نے اس حدیث کو علقمہ سے بھی سنا ہے اور براہ راست وائل بن حجر سے بھی، اس لئے شعبہ کا سند میں علقمہ کا ذکر کرنا ان کی بھول نہیں ہے بلکہ کمال حفظ کی دلیل ہے۔

رہ گئی یہ بات کہ حدیث کے الفاظ "ومد بھا صوته" اور شعبہ نے روایت کر دیا "خفض بہا صوتہ" تو یہ محض گمان ہے جس پر کوئی دلیل نہیں اور شعبہ جیسے فقیہہ ومحدث سے یہ بات بعید ہے کہ وہ اتنی بڑی غلطی کر جائیں گے، حالانکہ الفاظ اور مفہوم دونوں ہی اعتبار سے ان دونوں فقروں میں کوئی مناسبت نہیں ہے، اس طرح شعبہ وسفیان میں ترجیح دینا جب کہ دونوں کی ثقاہت محدثین کے نزدیک مسلمہ ہے، آسان نہیں ہے۔ چنانچہ یحییٰ بن سعید سفیان پر شعبہ کو ترجیح دیتے ہیں، یہی رائے امام نسائی نے امام بخاری سے نقل کی ہے۔

دیکھئے: ۱/ ۱٤٤، باب التابین وداء الامام۔

دارقطنی ۱/ ۳۳۳۔

اگر شعبہ نے سفیان کو اپنے آپ پر ترجیح دی ہے تو خود سفیان نے بھی حدیث میں شعبہ کو "امیر المؤمنین" قرار دیا ہے۔

اس لئے حقیقت یہ ہے کہ دو ایسے راویوں کے درمیان ترجیح کی کوشش جو حفظ وثقاہت اور اعتبار واستناد میں اہل فن کی نگاہ میں خاص مقام رکھتے ہوں، صحیح نہیں ہے اور دونوں ہی روایتیں ہم پلہ اور ایک ہی درجہ کی ہیں اور اگر کسی کو ترجیح ہی پر اصرار ہو تو پھر شعبہ کو سفیان پر ترجیح دی جانی چاہیئے اس لئے کہ سفیان اپنی روایت میں "تدلیس" بھی کیا کرتے تھے اور اس میں قوی وضعیف راوی کا بھی لحاظ نہیں رکھتے تھے، خود حافظ ابن حجر اور حافظ ذہبی نے اس کا اعتراف کیا ہے جب کہ حافظ ذہبی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شعبہ ضعیف راوی تو کجا قوی راوی سے بھی تدلیس سے گریز کرتے تھے اور اس کو سخت ناپسند کرتے تھے۔

عدل واعتدال کی راہ:

انصاف کی بات یہ ہے کہ رسول s سے بلند آواز میں آمین کہنا بھی ثابت ہے اور آہستہ بھی اور یہ دونوں ہی صورتیں فی الجملہ رسول s کی سنتوں اور طریقوں میں سے ہیں، البتہ ان دونوں میں سے نسبتاً زیادہ بہتر اور افضل کون سا طریقہ ہے، اس کے لئے ہم کو کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے، قرآن مجید نے دعا کے آداب اس طرح بتائے ہیں:

اُدعوا ربکم تضرعا وخفیة.

ترجمہ: اپنے رب سے دعا کرو عاجزی ظاہر کر کے اور چپکے چپکے۔
یعنی دل میں تضرع وخشیت کی کیفیت ہو اور آواز ہلکی وآہستہ ہو پھر اس پر سبھوں

ملخص از آثار السنن من ۹۷/ بذل المجهود۔

آثار السنن ۱/ ۹۷۔

کا اتفاق ہے کہ ''آمین'' دعا ہی ہے، خود امام بخاری نے عطاء ا سے نقل کیا ہے، **قال عطاء اٰمین دعاء.** اس کا تقاضا ہے کہ ''آمین'' کو بھی ہلکی آواز ہی میں کہا جائے۔

دوسرے نماز میں اصول یہ ہے، دو ہی چیزیں جہر کے ساتھ پڑھی جائیں قرآن مجید اور تکبیرات انتقال، اور آمین کے ذریعہ نہ تو ایک عمل سے دوسرے عمل کی طرف انتقال کیا جاتا ہے اور نہ یہ جزو قرآن ہی ہے............اس کا بھی تقاضا ہے کہ آمین کو آہستہ ہی کہا جانا چاہیے۔

یہ دونوں باتیں دراصل اس مسئلہ میں قول فیصل کا درجہ رکھتی ہیں اور آمین میں سر اور اخفاء کے بہتر اور راجح ہونے کو بے غبار کر دیتی ہیں، رہ گیا یہ کہ رسول s نے آمین جہراً کیوں پڑھی؟ تو ایک تو یہ بتانے کے لئے کہ یہ صورت جائز ہے۔ اور دین میں اس معاملے میں کشائش اور توسع ہے، نہ کہ غلو اور تنگی، دوسرے لوگوں کو تعلیم دینے کے لئے، چنانچہ رسول اللہ s کا طریقہ تھا کہ واردین اور نو مسلموں کی رعایت سے کبھی کبھی ان کلمات کو بھی بلند آواز سے ادا فرماتے تھے جو اصل میں آہستہ ادا کرنے کے ہیں حضرت عمر r کا بھی اسی طرح کا معمول تھا۔ حضرت عمر r نے ایک دفعہ ''ثناء'' کے کلمات بلند آواز میں پڑھے۔ حضرت ابو ہریرہ r نے ایک بار تعوذ کو زور سے پڑھا ''آمین'' کو تعلماً زور سے پڑھے جانے پر اس حدیث سے بھی روشنی پڑتی ہے جو ابوبشر دولابی نے ''کتاب الاسماء والکنیٰ'' میں یحییٰ بن سلمہ کے واسطہ سے حضرت وائل r سے نقل کی ہے کہ آپ s نے آمین زور سے کہی اور میں سمجھتا ہوں کہ حضور s نے ایسا ہم لوگوں کی تعلیم کے لئے کیا، **ما اراہ الا لیعلمنا.**

آثار السنن: ۱/ ۹۲۔

مناسب ہوگا کہ اس بحث کے اختتام پر امام طبری کی تحقیق ان ہی کے الفاظ میں نقل کر دی جائے۔

الصواب ان الخبرین بالجهر بها والمخافة صحیحان وعمل بکل من فعلیه جماعة من العلماء وان کنت مختارًا فخفض الصوت بها اذا کان اکثر الصحابة والتابعین علٰی ذلک

ترجمہ: صحیح یہ ہے کہ آمین کے جہر وسر دونوں کی روایتیں صحیح ہیں اور ہر روایت پر اہل علم کی ایک جماعت نے عمل کیا ہے لیکن اگر تم ترجیح ہی دو تو آواز کو پست رکھو، اس لئے کہ اکثر صحابہ وتابعین کا اسی پر عمل تھا۔

صرف فضیلت کا اختلاف:

تاہم جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ یہ اختلاف صرف افضلیت اور اولویت کا ہے اور فقہاء احناف کے نزدیک بھی بالجہر آمین کہنا جائز ہے البتہ آہستہ کہنا بہتر ہے۔ بعض فقہاء نے آمین کے زور سے کہنے کو مکروہ قرار دیا ہے مگر محققین کے نزدیک ایسا کہنا صحیح نہیں، اس لئے کہ امام ابو یوسف ا نے صراحۃً قنوت نازلہ میں بھی جہر کی اجازت دی ہے، پھر آمین جو خود بھی ایک دعائیہ لفظ ہے اور جس کا جہر سے ادا کیا جانا حدیث سے ثابت ہے، مکروہ کس طرح ہوسکتا ہے؟

[ ]

الجوہر النقی: ۲/ ۵۱۶۔

فیض الباری: ۲/ ۲۹۔

رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد رفع یدین

اس بات پر امت کا اجماع و اتفاق ہے کہ نماز کا افتتاح کرتے ہوئے دونوں ہاتھ اٹھائے جائیں گے، علامہ ابن حزم l اور امام اوزاعی وغیرہ کو چھوڑ کر عام فقہاء و محدثین کے نزدیک یہ مسنون و مستحب ہے اور اوزاعی اور ابن حزم l کے نزدیک رفع یدین واجب ہے۔ البتہ فقہاء کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ نماز میں کن مواقع پر رفع یدین کیا جائے گا؟ امام ابوحنیفہ اور قول مشہور کے مطابق امام مالک M \ کے نزدیک صرف ابتداء نماز میں ہی رفع یدین کیا جائے گا۔ یہی رائے متعدد اکابر صحابہ حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت براء بن عازب p وغیرہ سے منقول ہے اور امام ترمذی نے نقل کیا ہے کہ صحابہ و تابعین کی ایک جماعت کا یہی طریقہ تھا۔

امام شافعی l، امام احمد اور ایک گروہ کا خیال ہے کہ رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے اٹھتے ہوئے بھی رفع یدین کرنا مسنون یا مستحب ہے، بعض صحابہ p سے بھی یہ ہی طریقہ نقل کیا گیا ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر r، حضرت جابر r، حضرت ابو ہریرہ r، حضرت انس r حضرت عبداللہ بن زبیر r کے بارے میں منقول ہے کہ ان کا عمل بھی اسی پر تھا، حسن بصری، ابن سیرین اور بعض سلف صالحین سجدے میں جاتے

شرح زرقانی علی مؤطا امام مالک ١/ ١٥٧۔
ترمذی ١/ ٥٩ باب رفع الیدین عندالرکوع۔

ہوئے بھی رفع یدین کیا کرتے تھے۔

رفع یدین نہ کرنے پر احادیث:

غرض تکبیر تحریمہ کے علاوہ دوسرے مواقع پر بھی رفع یدین کرنا بہتر ہے یا نہ کرنا بہتر ہے؟ اس سلسلہ میں حضرت صحابہ کرام p اور سلف صالحین کے زمانہ سے اختلاف رائے ہے اور یہ اختلاف محض زیادہ اور کم بہتر کا ہے، نہ یہ کہ اس پر نماز کا صحیح یا قبول ہونا موقوف ہے لیکن افسوس کہ ہمارے زمانہ میں بعض حضرات نے ایک ایسے جزوی اور فروعی مسئلہ کو ایسی اہمیت دیدی ہے کہ گویا نماز کا صحیح ہونا اسی پر موقوف ہے، بلکہ بعض نادان اور کم فہم لوگ تو برملا کہتے ہیں اس کے بغیر نماز ہی نہیں ہوسکتی۔ (اللہ تعالیٰ ان حضرات کی اصلاح فرمائے)۔

اسی پس منظر میں پہلے ان احادیث وآثار کا ذکر کرتا ہوں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں صرف تکبیر تحریمہ کے ساتھ رفع یدین ہی اصل مسنون طریقہ ہے:

1 قال عبداللّٰہ بن مسعود الا اصلی بکم صلوۃ رسول اللّٰہ فصلی فلم یرفع یدیہ الا فی اول مرۃ.

ترجمہ: حضرت ابن مسعود r نے فرمایا: کیا میں تم لوگوں کو حضور s کی طرح نماز پڑھاؤں؟ پھر نماز پڑھائی تو صرف پہلی بار (آغازِ نماز میں) رفع یدین کیا۔

امام ترمذی l نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے علامہ ابن حزم

ہدایۃ المجتہد ١/ ١٣٣۔ رحمۃالامت: ٣٨۔ اوجز المسالک ١/ ٢٠٣۔ الثمر المدانی: ٨٨۔
ابو داؤد ١/ ١٠٩۔ باب من لم یذکر الرفع عند الرکوع، ترمذی ١/ ٥٩۔ نسائی۔ دارقطنی ١/ ٢٩٣۔ سننِ بیہقی ٢/ ٦٨۔ مصنف ابن ابی شیبہ ١/ ٢٣٦۔ طحاوی: ١٣٢۔ موطا امام محمد: ٩٣۔
ترمذی ١/ ٥٩، باب رفع الیدین عندالرکوع۔

1
J:\2009\ZamZam\Rah-e-Aetidal\1st Proof Chp-3-ok ....(15-06-09)

First Proof	15-06-09
Second Proof	00-00-00
FINAL	00-00-00
TOTAL-PAGE	242-1st-proof

انے صحیح قرار دیا ہے اور مشہور محدث یحییٰ بن سعید القطان نے بھی اوراس کے تمام راوی صحیح کے ہیں نسائی نے اس کو ایسی سند سے نقل کیا ہے جس کے تمام راوی بخاری ومسلم کے ہیں، سوائے عاصم بن کلیب اور سوید بن نصر کے، عاصم مسلم کے راویوں میں ہے اور سوید بھی ثقہ راوی ہیں۔

2 عن براء بن عازب كان النبى اذا كبر لافتتاح الصلوٰة رفع يديه ...... ثم لايعود.

ترجمہ: براء بن عازب r سے روایت ہے کہ رسول s جب آغاز نماز کیلئے تکبیر کہتے تو ہاتھ اٹھاتے، پھر دوبارہ ہاتھ نہیں اٹھاتے۔

علقمہ حضرت عبداللہ بن مسعود r سے نقل کرتے ہیں:

3 صليت مع رسول الله وابى بكر وعمر فلم يرفعوا ايديهم الا عند استفتاح الصلوٰة.

ترجمہ: میں نے رسول s اور حضرت ابوبکر r وعمر r کے ساتھ نماز پڑھی یہ حضرات صرف آغاز نماز ہی میں رفع یدین کرتے تھے۔

اس حدیث کی سند بھی قابل قبول ہے۔

4 لاترفع الايدى الا فى سبع مواطن اذا قام الى

المحلی ٤/ ٨٨۔

الفتح الربانی۔

الجوهر النقی ١/ ١٣٧۔

اعلاء السنن ٣/ ٤٨۔

ابو داؤد باب مالم يذكر الرفع عندالركوع، سنن بيهقى ٢/ ٧٦، دار قطنى ١/ ٢٩٣۔ مصنف عبدالرزاق ٢/ ٧١۔ ابن ابى شيبه ١/ ٢٣٦۔

سنن بيهقى ١/ ١٣٨۔

دیکھئے: الجواهر لنقی ١/ ١٣٨۔

الصلوٰة واذا رأى البيت وعلى الصفا والمروة وفى عرفات وفى جمع وعند الجمار.

ترجمہ: صرف سات ہی مواقع پر رفع یدین کیا جائے، جب نماز شروع کرے، جب بیت اللہ کو دیکھے، صفا پر، مروہ پر، عرفات میں، مزدلفہ میں اور رمی جمار کے وقت۔

یہ روایت مجمع الزوائد (١٠٣/٢) میں حضرت عبداللہ بن عمر r سے بھی نقل کی گئی ہے۔...........

میمون مکی سے مروری ہے کہ:

5 رأى عبدالله بن الزبير وصلى بهم يشير بكفيه حين يقوم وحين يركع وحين يسجد وحين ينهض للقيام فيقوم فيشير بيديه فانطلقت الىٰ ابن عباس فقلت انى رأيت ابن الزبير صلى صلوة لم أراحدًا يصليها فوصفت له الاشارة فقال ان احببت ان تنظر الى صلوة رسول صلى الله عليه وسلم فاقتد بصلوٰة عبد الله بن الزبير.

ترجمہ: انہوں نے حضرت عبداللہ بن زبیر r کو دیکھا کہ انہوں نے لوگوں کو نماز پڑھائی تو ابتداء نماز رکوع کو جاتے اور سجدہ میں جاتے اور دوسری رکعت کیلئے کھڑے ہوتے وقت دونوں ہتھیلیوں سے اشارہ کیا، میں نے حضرت عبداللہ ابن عباس r کے پاس جا کر کہا کہ میں نے حضرت عبداللہ بن زبیر

مصنف ابن ابى شيبه عن ابى عباس: ١/ ٢٣٧۔

ابو داؤد: د١/ ١٠٨۔

r کو اس طرح نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے کہ اور کسی کو بھی اس طرح نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا، حضرت عبداللہ ابن عباس r نے فرمایا کہ اگر تم کو پسند ہو کہ رسول s کی نماز کو دیکھو تو ابن زبیر r کی اقتداء کرو۔

اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ حضرات صحابۂ کرام p کا عام معمول رفع یدین نہ کرنے کا تھا، اسی لئے تو جب حضرت عبداللہ ابن زبیر r نے رفع یدین کیا تو راوی کو حیرت ہوئی اور وہ رفع حیرت کے لئے حضرت عبداللہ ابن عباس r سے دریافت کرنے آئے، حضرت عبداللہ ابن عباس r کی گفتگو کا منشا یہ تھا کہ یہ طریقہ بھی حضور s سے ثابت ہے، اس لئے اس سے توحش نہ چاہئے۔

آثار صحابہ p:

1 رأيت عمر بن الخطاب يرفع يديه فى اول تكبيرة ثم لايعود. [1]

ترجمہ: میں نے حضرت عمر r کو پہلی تکبیر میں رفع یدین کرتے دیکھا، اس کے بعد پھر رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

امام طحاوی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے، علامہ ترکمانی نے الجوہر النقی میں لکھا ہے کہ یہ روایت مسلم کی سطح کی ہے، **صحيح علىٰ شرط مسلم.** خود حافظ ابن حجر ا نے **"الدراية فى تخريج احاديث الهداية"** میں اس کے صحیح ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ **هذا رجاله ثقات.**

2 ان عليا كان يرفع يديه فى اول تكبيرة من الصلوة

[1] طحاوی: ۱۳۳۔ ابن ابی شیبہ عن اسود ۱/ ۲۳۷۔

ثم لايرفع بعد. [1]

ترجمہ: حضرت علی r تکبیر اول میں رفع یدین کرتے تھے۔ اس کے بعد نہیں کرتے تھے۔

حافظ ابن حجر جو خود رفع یدین کے قائل ہیں، انہوں نے بھی "الدرایۃ" میں اس روایت کی صحت کو تسلیم کیا ہے، بیہقی نے اس روایت کے ایک راوی "ابوبکر نہشلی" پر جرح کیا ہے مگر علامہ ابن ترکمانی وغیرہ نے ان کی تنقید کو قابل اعتناء نہیں سمجھا ہے۔ اس لئے کہ امام احمد بن حنبل ا یحییٰ بن معین اور ابوحاتم جیسے ناقدین حدیث نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔ اور بخاری و مسلم اور ترمذی نے ان کی سند سے روایت نقل کی ہے۔ [2]

3 وعن مجاهد قال صليت خلف ابن عمر فلم يكن يرفع يديه الامن التكبيرة الاولىٰ من الصلوٰة. [3]

ترجمہ: مجاہد سے مروی ہے کہ میں نے ابن عمر r کے پیچھے نماز ادا کی، انہوں نے تکبیر اولیٰ کے سوا نماز میں کسی اور موقع پر رفع یدین نہیں کیا۔

حضرت عبداللہ بن عمر کا رفع یدین نہ کرنے کا معمول ان کے ایک اور شاگرد عبدالعزیز بن حکم سے بھی منقول ہے [4] حالانکہ ابن عمر ہی کی روایت رفع یدین کے قائلین کی اصل دلیل ہے۔

4 كان عبدالله بن مسعود لايرفع يديه فى شئٍ من الصلوة الا فى الافتتاح. [5]

[1] طحاوی: ۱۳۲۔ ابن ابی شیبہ ۱/۲۳۶۔ بیہقی عن عاصم بن کلیب مؤطا امام محمد: ۹۲۔

[2] الجوہر النقی ۲/ ۷۸۔

[3] طحاوی بیہقی، ابن ابی شیبہ عن مجاہد ۱/ ۲۳۷۔

[4] مؤطا امام محمد: ۹۳۔

[5] موطا امام محمد: ۹۴۔ مصنف عبدالرزاق ۱/۷۱ طحاوی: ۱/۱۳۳۔ ابن ابی شیبہ عن ابراہیم ۱/ ۲۳۶۔

ترجمہ: حضرت ابن مسعود r تکبیر افتتاح کے سوا کسی اور موقع پر رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

یہ اثر سند کے لحاظ سے قوی ہے لیکن ابراہیم نخعی کی ابن مسعود r سے ملاقات ثابت نہیں، امام طحاوی ا نے نقل کیا ہے کہ اعمش نے خود ابراہیم ا سے نقل کیا ہے کہ جب حضرت عبداللہ سے براہ راست روایت کروں تو سمجھ لو کہ ایک جماعت نے مجھ سے یہ روایت نقل کی ہوگی۔ اس لئے یہ مرسل روایت ضعیف نہیں ہے بلکہ سند متصل سے بھی زیادہ قوی ہے۔

5 کان اصحاب عبداللّٰہ و اصحاب علی لا یرفعون ایدیھم الا فی افتتاح الصلوٰۃ قال وکیع ثم لا یعودون.

ترجمہ: حضرت ابن مسعود اور حضرت علی r کے اصحاب آغاز نماز کے علاوہ رفع یدین نہیں کرتے تھے، وکیع کہتے ہیں کہ ایک بار کے بعد دوبارہ رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

علامہ ترکمانی نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود r سے صرف آغاز نماز میں رفع یدین سے متعلق رسول s کا معمول مبارک جو اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ خود امام ابوحنیفہ ا سے بھی اس طرح مروی ہے:

ابو حنیفہ عن حماد عن ابراھیم عن علقمۃ و اسود عن عبداللّٰہ بن مسعود الخ.

شرح معانی الآثار ۱/ ۱۳۳۔
ابن ابی شیبہ عن ابی اسحاق ۱/ ۲۳۶۔
التعلیق الحسن ۱/ ۱۰۹۔

First Proof	15-06-09
Second Proof	00-00-00
FINAL	00-00-00
TOTAL-PAGE	242-1st-proof

ترجمہ: امام ابوحنیفہ ا حماد سے وہ ابراہیم نخعی سے، وہ علقمہ اور اسود سے اور وہ حضرت عبداللہ بن مسعود r سے......

ابن ابی شیبہ نے بھی ''حماد'' سے اسی سند سے اس روایت کو نقل کیا ہے، یہ سند سلسلۃ الذہب کی حیثیت رکھتی ہے جس کے تمام رواۃ ائمہ فن اور اساتذہ وقت رہے ہیں۔

صحابہ p میں ابن مسعود کا مقام:

بعض لوگوں نے لکھ دیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود r سے اس مسئلہ میں بھول ہوئی ہے اور اس کو ثابت کرنے کیلئے ان کے سہو کی ایک فہرست بھی تیار کرنے کی سعی کی ہے، حالانکہ نماز جیسے مسئلہ میں جو دن بھر میں کم از کم پانچ بار پڑھی جاتی ہے اور بلا ناغہ روزانہ پڑھی جاتی ہے، اس طرح کی بھول بالکل قرین قیاس نہیں ہے جن مسائل میں حضرت عبداللہ کا سہو نقل کیا جاتا ہے وہ سہو نہیں بلکہ اجتہادی اختلاف ہے اور علامہ ترکمانی نے ''الجوہر النقی'' میں اور علامہ نیموی ا نے ''آثار السنن'' میں اس پر بڑی اچھی روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح کے تفردات دوسرے صحابہ p کے یہاں بھی موجود ہیں۔ نواب صدیق حسن خان نے خود حضرت عبداللہ ابن عمر r کے بارہ تفردات نقل کئے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن الزبیر r سے رفع یدین کی حدیث مروی ہے ان کے بارے میں منقول ہے کہ وہ نماز جنازہ اور عیدین کے لئے بھی اذان دلایا کرتے تھے۔ اگر اس طرح کی باتوں کو بنیاد بنا کر کسی روایت کو رد کیا جائے تو پھر کسی حدیث پر اعتماد کرنا مشکل ہوجائے گا۔

افسوس کہ بعض حضرات نے حضرت عبداللہ بن مسعود r کے متعلق وہ لب ولہجہ اختیار کیا ہے جو کسی صحابی کی شان کے خلاف ہے، مجھے یہ لکھنے میں کوئی تامل

نہیں ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے سوءِ آخرت کا اندیشہ ہے اور یہ سخت محرومی اور خسران کی بات ہے، صحبت نبوی s بجائے خود اتنا بڑا اشرف ہے کہ ہر مسلمان کے دل کو ان کے بارے میں بے کدورت اور زبان کو محتاط کرنے کے لئے کافی ہے۔ پھر صحابہ p میں ابن مسعود r کا خاص مقام ہے...... وہ رسول s سے اس قدر قریب تھے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ میں نے ابتداء میں سمجھا کہ وہ بھی خانوادۂ رسالت ہی کے ایک رکن ہیں[1] ایک موقع پر آپ s نے فرمایا: قرآن کو چار آدمیوں سے حاصل کرو اور پھر پہلے نمبر پر حضرت ابن مسعود r کا نام لیا[2] ابن مسعود وہ صحابی تھے کہ آپ s کے نعل مبارک، مسواک، تکیہ وغیرہ آپ ہی کے پاس رہتا تھا[3] حضرت حذیفہ r سے مروی ہے کہ ابن مسعود r جو کچھ کہیں اس کی تصدیق کرو[4] ایک اور روایت میں ہے کہ ابن مسعود r جس طرح پڑھائیں اسی طرح پڑھو[5] حضرت عمر r نے جب آپ s کو کوفہ بھیجا تو خط لکھا کہ عبداللہ ابن مسعود r کو بھیج کر میں ایثار سے کام لے رہا ہوں۔ حضرت علی r فرمایا کرتے اگر میں بغیر مشورہ کے کسی کو امیر بناتا تو ابن مسعود r کو بناتا[6] خود آپ s نے فرمایا کہ ابن مسعود r نے میری امت کے لئے جس بات کو ناپسند کیا، اس کو میں نے بھی پسند کیا اور جسے ناپسند کیا اسے میں نے ناپسند کیا وہ چھٹے اسلام قبول کرنے والے ہیں، خود رسول s نے آپ r کے جنتی ہونے کی شہادت دی

[1] مسلم عن ابی موسیٰ ۲/ ۲۹۶۔

[2] بخاری ۱/ ۵۳۱ و مسلم ۲/ ۲۹۳ عن عبداللہ بن عمرو۔

[3] بخاری عن علقمہ ۱/ ۵۳۱۔

[4] ترمذی عن حذیفہ ۲/ ۲۲۱۔

[5] حوالہ سابق۔

[6] ابن ماجہ ۱/ ۱۳ و ترمذی ۲/ ۲۲۱ عن علی۔

[7] الاکمال فی اسماء الرجال ص ۶۰۵۔

ہے۔[7] حضرت حذیفہ r فرمایا کرتے تھے کہ چال ڈھال میں لوگوں میں حضور s سے سب سے زیادہ مشابہ عبداللہ بن مسعود r ہیں۔[8]

ایسے صحابی کے بارے میں جن لوگوں کا لب ولہجہ ناشائستہ ہو ان کو خود اپنی آخرت کی خیر منانی چاہئے۔ والی اللہ المشتکی۔

رفع یدین...... احادیث کی روشنی میں:

جو لوگ رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے اٹھتے ہوئے رفع یدین کے قائل ہیں وہ درج ذیل احادیث سے استدلال کرتے ہیں:

1 ان رسول اللّٰہ یرفع یدیه حذو منکبیه اذا افتتح الصلوٰۃ اذا واکبر للرکوع واذا رفع رأسه من الرکوع رفعها کذلک وقال سمع اللّٰہ لمن حمده ربنا لک الحمد وکان لایفعل ذلک فی السجود[9]

ترجمہ: رسول اللہ s مونڈھوں تک ہاتھ اٹھاتے تھے جب نماز شروع کرتے، جب رکوع کے لئے اللہ اکبر کہتے، جب رکوع سے سر اٹھاتے اور "سمع اللہ حمدہ، ربنا لک الحمد" کہتے، سجدہ میں ایسا نہیں کرتے۔

2 کان رسول اللّٰہ اذ اکبر رفع یدیه حتی یحاذی بهما اذنیه واذا رفع راسه من الرکوع فقال سمع اللّٰه لمن حمده فعل مثل ذلک[10]

ترجمہ: آپ s جب تکبیر کہتے کانوں تک ہاتھ اٹھاتے اور جب رکوع

[8] بخاری عن حذیفہ ۱/ ۵۳۱۔

[9] بخاری ۱/ ۱۰۲۔ / ومسلم عن ابن عمر ۱/ ۱۶۸۔

[10] بخاری ۱/ ۱۰۲ ومسلم عن مالک بن حویرث: ۱/ ۱۶۸۔

سے سر اٹھاتے تو "سمع اللّٰہ لمن حمدہ" کہتے تو اور اس موقع سے بھی ایسا ہی کرتے۔

3 عن وائل بن حجر انه رأى النبى صلى الله عليه وسلم رفع يديه اذا دخل فى الصلوٰة كبر ثم التحف بثوبه ثم وضع يده اليمنى علىٰ يده اليسرىٰ فلما اراد ان يركع اخرج يديه من الثوب ثم رفعهما وكبر فركع فلما قال سمع الله لمن حمده رفع يديه فلما سجد سجد بين كفيه. 🗁

ترجمہ: حضرت وائل بن حجر r سے مروی ہے کہ انہوں نے آپ s کو دیکھا کہ آپ نماز میں جاتے ہوئے اللہ اکبر کہتے اور رفع یدین کرتے، پھر کپڑے میں لپٹ جاتے پھر دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر باندھ لیتے پھر جب رکوع کرنا چاہتے تو اپنے ہاتھ کپڑوں سے نکال لیتے اور دونوں ہاتھ اٹھاتے اور اللہ اکبر کہتے ہوئے رکوع میں جاتے، پھر جب "سمع الله لمن حمده" کہتے تو دونوں ہاتھ اٹھاتے اور سجدہ کرنا ہوتا تو دونوں ہاتھوں کے درمیان کرتے۔

یہ حدیثیں صرف اس بات کو بتاتی ہیں کہ رسول s رفع یدین کیا کرتے تھے۔ اس سے سبھوں کو اتفاق ہے کہ ابتداء اسلام میں حضور s ایک سے زیادہ مواقع پر رفع یدین کیا کرتے تھے، اختلاف اس بات میں ہے کہ حضور s کا آخری عمل کیا تھا؟ کیا اخیر تک آپ s کا یہی عمل رہا، یا اخیر زندگی میں آپ s کا معمول صرف آغاز نماز ہی میں رفع یدین کا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث بیہقی نے اس اضافہ کے ساتھ نقل کی ہے:

🗁 مسلم ١/ ١٧٣۔

فما زالت تلك صلوته حتى لقى الله 🗁

ترجمہ: وفات تک آپ s کی نماز اسی طرح ہوتی تھی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وفات تک آپ s کا یہی معمول رہا، اگر یہ حدیث صحیح سند سے ثابت ہوتی تو شاید اس باب میں "حجت قاطعہ" ہوتی، مگر افسوس کہ یہ روایت فنی اعتبار سے قابل اعتبار نہیں ہے۔ بیہقی نے اس روایت کو دو سندوں سے نقل کیا ہے۔ ایک سند میں "عصمت بن محمد انصاری" ہیں، جن کو ابو حاتم نے ضعیف اور یحییٰ بن معین نے کذاب اور واضع حدیث قرار دیا ہے اور عقیل نے لکھا ہے کہ یہ شخص ثقہ آدمیوں کے حوالے سے جھوٹی باتیں نقل کرتا ہے **يحدث بالبواطل عن الثقات.** دوسری سند میں عبدالرحمٰن بن قریش ہروی ہیں، حافظ ذہبی نے نقل کیا ہے کہ سلیمان نے ان کو واضع حدیث قرار دیا ہے۔ اس لئے بجا طور پر خاتم المحدثین علامہ ظہیر الدین احسن نیموی l نے اس حدیث کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ حدیث ضعیف بلکہ موضوع ہے **هو حديث ضعيف بل موضوع.** 🗎

"رفع یدین" کے ثبوت کے لئے یہی حدیثیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، اس کے علاوہ بھی بعض احادیث وآثار ہیں مگر وہ ضعف اور سقم سے خالی نہیں ہیں۔ جو لوگ رفع یدین کے قائل ہیں ان کو بھی اس کا اعتراف ہے۔ مثلاً ابو ہریرہ r کی روایت ہے، اس کو اسماعیل بن عیاش نے صالح بن کیسان سے نقل کیا ہے 🗏 صالح شامی نہیں ہیں اور محدثین کے نزدیک اسماعیل کی روایت غیر شامیوں سے درست نہیں ہے۔ اس حدیث کی ایک سند

🗁 سنن بیهقی ٢/ ٢٣۔
🗎 آثار السنن ١/ ١٠١۔
🗏 ابن ماجه: ٦٢۔

میں یحییٰ بن ایوب ہیں جو ضعیف ہیں۔ابن ماجہ نے حضرت جابر r سے روایت کیا ہے، اس کی سند میں موسیٰ بن مسعود ہیں جن کو امام احمد l ، امام ترمذی l اور ابن خزیمہ جیسے محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے، ابن عباس q سے ابن ماجہ نے اس کے حق میں روایت نقل کی ہے لیکن ابن ماجہ کی سند میں عمر بن رباح ہیں [1] جن کو امام نسائی اور دارقطنی نے غیر معتبر قرار دیا ہے۔ابو داوَد کی روایت میں عبداللہ بن لھیعہ ہیں، جن کو بعض محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ [2]

حضرت انس r سے دارقطنی نے رفع یدین پر رسول s کا معمول نقل کیا ہے لیکن امام طحاوی نے لکھا ہے کہ تمام رواۃ اس کو خود حضرت انس کا عمل قرار دیتے ہیں۔صرف عبدالوہاب ثقفی نے اس کو آنحضور s تک پہنچایا ہے [3] خود دارقطنی کو بھی اعتراف ہے کہ یہ حضرت انس کا اپنا فعل ہے۔ **الصواب من فعل انس** r. [4]

افتتاح نماز کے علاوہ دوسرے مواقع پر جن حضرات سے رفع یدین کی روایتیں منقول ہیں ان میں تین اہم راوی حضرت عبداللہ بن عمر r حضرت مالک بن حویرث r اور حضرت وائل بن حجر r ہیں۔ان حضرات کی روایتوں میں کتنا تعارض اور اضطراب ہے اس کا اندازہ نیچے درج کئے ہوئے نقشہ سے ہوگا۔راقم الحروف نے ازراہ اختصار حدیث کے الفاظ کے بجائے رفع یدین کے مواقع اور کتابوں کے حوالجات درج کرنے پر اکتفا کیا ہے:۔

[1] ابن ماجه ص: ٦٢۔
[2] ابو داؤد ١/ ١٠٨۔
[3] طحاوی ١/ ١٣٤۔
[4] دار قطنی ١/ ٢٩٠۔

حضرت عبداللہ ابن عمر r:

1 صرف نماز کے آغاز میں [1]

واضح ہو کہ یہ قولی حدیث ہے اور قولی حدیث کی اہمیت فعلی حدیث سے زیادہ ہوتی ہے۔

2 آغاز نماز، رکوع کے بعد۔ [2]

3 آغاز نماز، رکوع سے پہلے، رکوع کے بعد۔ [3]

4 آغاز نماز، رکوع سے پہلے، رکوع کے بعد، دوسری رکعت کے بعد۔ [4]

5 آغاز نماز، رکوع سے پہلے، سجدہ سے پہلے۔ [5]

6 رکوع سے پہلے، سجدہ سے پہلے۔ [6]

7 آغاز نماز، رکوع سے پہلے، رکوع کے بعد، سجدہ سے پہلے دو رکعتوں کے درمیان۔ [7]

8 ہمیشہ اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر جاتے ہوئے۔ [8]

[1] المدونه ١/ ٧١۔مجمع الزوائد بحواله طبرانی ٢/ ١٠٢۔
[2] مؤطا امام مالك ٢٥، مؤطا امام محمد ٧٩۔ سنن بیهقی ٢/ ٦٩۔
[3] بخاری ١/ ١٠٢۔مسلم ١/ ١٦٨۔ابوداؤد ١/ ١٠٤۔ترمذی ١/ ٥٩، نسائی ١/ ٤٠۔ ابن ماجه ٦١۔ ابن حبان ٢/ ٢٥٣۔ طحاوی ١/ ١٣١۔
[4] بخاری ١/ ١٠٣ مصنف عبدالرزاق ٢/ ٦٨۔بیهقی ٢/ ٧٠۔المحلی ٤/ ٩٠۔
[5] ابوداؤد ١/ ١٠٨۔
[6] مجمع الزوائد ٢/ ١٠٢۔
[7] المحلی ٤/ ٩٣۔
[8] مشکل الآثار۔

5 ہر تکبیر کے ساتھ۔

ان روایات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جن کی روایات پر رفع یدین کا انحصار ہے ان روایتوں میں کس درجہ اختلاف پایا جاتا ہے؟ اور ۴ رکعت کی نماز میں ایک رفع یدین سے لے کر (۲۲) تک رفع یدین ثابت ہے.........اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود r جن کی روایت رفع یدین کے قائلین کے لئے اصل اور بنیاد کا درجہ رکھتی ہے، خود ان کا عمل صرف ابتداء نماز رفع یدین کا تھا، جیسا کہ امام مجاہد کی روایت سے ظاہر ہے اور اس کا ذکر اوپر آچکا ہے اور راوی جب خود اپنی روایت پر عامل نہ ہو تو ضرور ہے کہ اس روایت میں کوئی سقم موجود ہوگا جس پر عام لوگ واقف نہ ہو پائے ہوں۔ نیز رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد رفع یدین کی جو روایتیں حضرت عبداللہ بن عمر r سے منقول ہیں وہ آپ s کا فعل ہے اور جو روایت صرف آغاز نماز سے متعلق ہے وہ حدیث قولی ہے اور حدیث قولی کو حدیث فعلی پر ترجیح ہوتی ہے۔

ترجیح وتوسع:

یہ ساری بحث تو ان احادیث وآثار کی صحت اور ضعف اور اس کے معتبر ہونے اور نہ ہونے سے متعلق ہے اور اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دونوں ہی نقطۂ نظر کے لئے حدیثیں موجود ہیں، سب سے اہم بات یہ ہے کہ عہد صحابہ p ہی سے رفع یدین کا کرنا اور نہ کرنا مسلمانوں کی ایک قابل لحاظ جماعت کا معمول رہا ہے۔ فقہ حنفی کی بنیاد عام طور پر ان صحابہ کی احادیث اور معمولات پر ہیں جو کوفہ میں قیام پذیر ہو گئے تھے چنانچہ گذر چکا ہے کہ حضرت علی r اور عبداللہ بن مسعود r کے اصحاب رفع یدین نہیں کیا کرتے تھے۔ کوفہ عہد فاروقی سے صحابہ کا کیسا مرکز ومرجع بن گیا تھا، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ علامہ ابن ہمام نے نقل کیا

ابو داؤد ۱/ ۱۰۵۔

حضرت مالک ابن حویرث r:

1 آغاز نماز، رکوع سے پہلے، رکوع کے بعد۔

2 آغاز نماز، رکوع سے پہلے، رکوع کے بعد، سجدہ کے بعد۔

3 آغاز نماز، رکوع سے پہلے، رکوع کے بعد، دوسجدوں کے درمیان۔

4 رکوع سے پہلے، رکوع کے بعد، دوسجدوں کے درمیان۔

5 رکوع سے پہلے، رکوع کے بعد، دو رکعتوں کے درمیان کھڑے ہوتے ہوئے۔

6 رکوع سے پہلے، رکوع کے بعد۔

حضرت وائل بن حجر r:

1 آغاز نماز، رکوع سے پہلے، رکوع کے بعد۔

2 آغاز نماز، رکوع سے پہلے، رکوع کے بعد، سجدہ سے پہلے۔

3 آغاز نماز، رکوع سے پہلے، سجدہ سے پہلے۔

4 آغاز نماز، رکوع سے پہلے، رکوع کے بعد، دوسجدوں کے درمیان۔

بخاری ۱/ ۱۰۲۔ مسلم ۱/ ۱۶۸۔ طحاوی ۱/ ۱۲۱۔
مسند احمد (الفتح الربانی ۳/ ۱۶۷۔
ابن ماجہ ۶۱۔
المحلی: ٤/ ۹۲۔
ابن ماجہ ۱, ۱٦، طحاوی ۱/ ۱۳۱، بیھقی ۲/ ۷۲۔
طحاوی ۱/ ۱۳۳۔
ابن ماجہ ۱/ ۱٦۔ نسائی ۱/ ۱٤۱۔
ابو داؤد ۱/ ۱۰۵۔
دارقطنی ۱/ ۲۹۔
طحاوی ۱/ ۱۳۲۔

ہے کہ کوفہ کے صرف ایک قریہ ''قرقیسہ'' میں چھ سو صحابہ مقیم ہو گئے تھے، بعض علماء تاریخ کے بیان کے مطابق کوفہ میں مقیم ہونے والے صحابہ کی تعداد پندرہ سو تھی۔

امام مالک ا اپنے مسلک میں اہل مدینہ کے تعامل کو خاص اہمیت دیتے ہیں اور ظاہر ہے مدینہ میں صحابہ کی ایک قابل لحاظ تعداد موجود تھی، اس لئے رفع یدین نہ کرنا یقیناً مدینہ اور کوفہ میں عہد صحابہ سے متواتراً ہوتا آیا ہوگا جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود r کی روایت میں آیا کہ میں نے حضرت ابوبکر وعمر p کو رفع یدین کرتے ہوئے نہیں دیکھا، اسی طرح مکہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر r کا معمول رفع یدین کا تھا اور غالباً عبداللہ ابن زبیر r ہی سے مکہ میں اس کا زیادہ تعامل ہوا، کیوں کہ بات آچکی ہے کہ ابتداءً آپ s کے اس عمل پر لوگوں کو حیرت ہوئی یہاں تک کہ لوگوں نے تحقیق کے لئے عبداللہ ابن عباس r سے رجوع کیا۔ اور یہی تعامل امام شافعی اور امام احمد L کے مسلک کی بنیاد ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ بظاہر ان متعارض روایات کے درمیان کس طرح مطابقت پیدا کی جائے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ سنت رسول میں توسع مان لیا جائے کہ کبھی رفع یدین کرتے تھے اور کبھی نہیں کرتے تھے اس لئے دونوں صورتیں درست ہیں۔ اور اداءِ سنت کے لئے کافی ہیں۔

نہ رفع یدین کرنے والوں کو تارک سنت سمجھا جائے اور نہ رفع یدین نہ کرنے والوں کو۔ البتہ مختلف وجوہ ہیں جن کا تقاضا ہے کہ رفع یدین نہ کرنے کی سنت زیادہ افضل واولیٰ ہے۔

1 حضرت عبداللہ ابن مسعود r کے سوا ''رفع یدین'' کے اکثر راویوں سے رفع یدین کا ترک کرنا بھی ثابت ہے۔ خود حضرت عبداللہ ابن عمر

فیض الباری ۲/ ۲۵۶۔

r جن کی حدیث رفع یدین کے بارے میں سب سے قوی سمجھی گئی ہے اور جس کی امام بخاری ا نے تخریج کی ہے انہیں سے امام طحاوی ا نے نہایت قوی سند سے ''رفع یدین'' نہ کرنا ذکر کیا ہے۔

حدثنا ابن ابی داؤد قال حدثنا احمد بن یونس قال حدثنا ابوبکر بن عیاش عن حصین عن مجاهد قال صلیت خلف ابن عمر لم یکن یرفع یدیه الافی التکبیرة الاولیٰ من الصلوٰة.

ترجمہ: ابن ابی داؤد نے احمد بن یونس سے، احمد نے ابوبکر بن عیاش سے، انہوں نے حصین سے اور حصین نے مجاہد سے نقل کیا ہے کہ میں نے ابن عمر کے پیچھے نماز ادا کی مگر وہ سوائے تکبیر اولیٰ کے رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

اس سند کے تمام راوی قوی ہیں۔ ابوبکر بن عیاش پر بعض لوگوں نے جرح کی ہے مگر ان کی ثقاہت اور استناد کے لئے یہی کافی ہے کہ خود امام بخاری ا نے ان سے روایت کیا ہے۔ خود حافظ ابن حجر ا نے ''تقریب التہذیب'' میں اعتراف کیا ہے کہ وہ ثقہ ہیں، البتہ بوڑھاپے میں ان کا حافظہ کمزور ہو گیا تھا۔ ایسے لوگوں کے متعلق اصول یہ ہے کہ ان کے ابتدائی شاگردوں کی روایت قبول کی جائے گی۔ احمد بن یونس، ابوبکر بن عیاش کے ایسے ہی تلامذہ میں ہیں۔ چنانچہ خود امام بخاری ا نے اپنی صحیح بخاری میں کتاب التفسیر میں احمد بن یونس کے واسطے سے ان کی روایت قبول کی ہے۔ پھر امام مجاہد کے علاوہ امام محمد ا نے اپنی مؤطا میں ابن عمر r کے ایک شاگرد عبدالعزیز بن حکیم سے بھی حضرت عبداللہ r کا رفع یدین نہ کرنا نقل کیا ہے۔

شرح معانی الآثار/ ۱۳۳عن مجاهد۔

پس ایک صحابی کا رفع یدین کی روایت نقل کرنا اور اس پر عمل نہ کرنا بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ رفع یدین نہ کرنے کو ترجیح حاصل ہے۔

2 رفع یدین نہ کرنا قرآن مجید کے احکام اور نماز کی کیفیت سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے اس لئے کہ قرآن مجید نے نماز کی کیفیت میں خشوع کو خاص اہمیت دی ہے۔
اَلَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ. (مؤمنون ۲)
دل کا خشوع دل میں گریہ کی کیفیت اور توجہ الی اللہ ہے، آواز کا خشوع یہ ہے کہ آواز پست رہے، عمل کا خشوع یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ سکون ہو اور کم سے کم حرکت۔ رفع یدین نہ کرنے میں حرکت کم ہے اس لئے یہ صورت زیادہ بہتر ہوگی۔

3 علامہ باجی مالکی l نے لکھا ہے کہ دراصل تکبیرات انتقال ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال کے لئے ہے۔ پس چونکہ ابتداء نماز میں ایک عمل سے دوسرے عمل کی طرف انتقال کا مفہوم نہیں پایا جاتا اس لئے اس کے ساتھ رفع یدین بھی کر دیا گیا۔ دوسرے ارکان میں چوں کہ انتقال کی کیفیت موجود ہے اس لئے رفع یدین کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

4 امام طحاوی l کہتے ہیں کہ تکبیرات افتتاح کے وقت رفع یدین ہے اور سجدوں کے درمیان تکبیر کے ساتھ رفع یدین نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ رکوع والی تکبیر کو ان دونوں میں سے کس کے مماثل سمجھا جائے، اگر تکبیر افتتاح کے، تو رفع یدین ہونا چاہئے اور اگر سجدہ والی تکبیر کے تو رفع یدین نہیں ہونا چاہئے۔ غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تکبیر کے مماثل ہے۔
اس لئے کہ جیسے سجدوں کے درمیان تکبیر مسنون ہے واجب نہیں، یہی حال اس تکبیر کا بھی ہے، جب کہ تکبیر افتتاح فرض ہے۔ لہٰذا جیسے سجدہ والی تکبیروں میں رفع یدین نہیں ہے اسی طرح رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد بھی تکبیر نہیں ہونی چاہئے۔

5 رفع یدین کے ثبوت میں جو حدیثیں ہیں وہ فعلی ہیں اور سات مواقع پر رفع یدین کرنے سے متعلق حضرت عبداللہ ابن عباس r کی جو روایت ذکر کی گئی ہے جس میں صرف آغاز نماز میں رفع یدین کا ذکر ہے وہ ''قولی'' ہے۔ اور قاعدہ یہ ہے کہ جہاں دو قسم کی روایتیں متعارض ہوں وہاں قولی حدیث کو ترجیح دی جاتی ہے .... یہ قولی حدیث اس لئے بھی قابل ترجیح ہے کہ آپ کے فعل و عمل کی بابت روایات میں تعارض ہے۔ جبکہ قولی روایت صرف رفع یدین نہ کرنے کو بتاتی ہے، اس میں تعارض اور ٹکراؤ نہیں ہے۔

6 جن صحابہ p سے رفع یدین کرنا ثابت ہے ان سے رفع یدین نہ کرنا بھی ثابت ہے اور حضرت ابن مسعود r سے رفع یدین نہ کرنا تو ثابت ہے رفع یدین کرنا ثابت نہیں۔

7 جن حضرات صحابہ p سے رفع یدین کرنا ثابت ہے وہ کم عمر صحابہ ہیں جن کو آپ s کی صحبت کم ملی اور جو اپنی کم سنی کی وجہ سے پیچھے کی صفوں میں کھڑے ہوتے تھے مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر r اور حضرت عبداللہ بن زبیر r وغیرہ، اور حضرت علی وحضرت عبداللہ بن مسعود r اکابر وفقہاء صحابہ میں ہیں اور بارگاہ رسالت کے ہر وقت کے حاضر باش لوگوں میں ہیں، اس لئے ان حضرات کی روایت زیادہ قابل ترجیح ہوگی۔

8 امام ابو حنیفہ l کے واسطہ سے حضرت عبداللہ بن مسعود r سے جو روایت نقل کی گئی ہے اس سند میں حماد، ابراہیم، علقمہ، اور ابن مسعود جیسے فقیہ وفہیم راوی ہیں جو حدیث کے فہم اور اس سے احکام کے اخذ واستنباط میں اپنے معاصرین پر تفوق رکھتے تھے۔ اس لئے یہ روایت راجح ہوگی، امام اوزاعی رفع یدین کے قائل تھے اور ابن عمر r کی حدیث سے استدلال کرتے تھے لیکن جب امام ابو حنیفہ l نے ابن مسعود r کی روایت سے

استدلال کیا اور وجہ ترجیح یہ بیان کی کہ اس حدیث کے راوی زیادہ ثقہ ہیں تو امام اوزاعی بھی اس سے اختلاف نہ کر سکے۔ 🗁

احناف کے مسلک کی وضاحت:

یہاں اس بات کی وضاحت نامناسب نہ ہوگی کہ رفع یدین احناف کے یہاں گناہ یا مفسد نماز یا مکروہ نہیں ہے۔ امام ابوبکر جصاص رازی نے جو چوتھی صدی ہجری کے فقہاء میں ہیں اور امام کرخی ا کے اساتذہ میں ہیں "کتب علیکم الصیام"، کے ذیل میں رفع یدین کو جائز قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اختلاف صرف افضلیت میں ہے۔ علامہ کشمیری اس قول کو ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

ثم تتبعت الكتب للتصريح بالجواز فوجدت ابابكر الجصاص قدصرح فی احكام القرآن تحت قوله تعالىٰ "كتب عليكم الصيام" ان المسألة اذا وردت فيها الاحاديث الصحاح من الجانبين فالخلاف فيها لايكون الافی الاختيار سيما اذا كانت كثيرة الوقوع وعد منها الترجيح فی الاذان وافراد الاقامة والجهر بالتسمية ورفع اليدين. 🗎

ترجمہ: میں نے جواز کی صراحت معلوم کرنے کے لئے کتابوں میں جستجو کی تو دیکھا کہ ابوبکر جصاص ا نے احکام القرآن میں کتب علیکم الصیام کے تحت صراحت کردی ہے کہ مسئلہ میں جب دونوں پہلوؤں پر صحیح حدیثیں موجود ہیں بالخصوص اگر وہ کثیر الوقوع مسائل میں ہوں تو اختلاف صرف افضلیت میں ہوگا پھر امام رازی

🗁 اوجز المسالك ۲/ ۲۰۹۔

🗎 فيض الباری ۲/ ۲۵۸_۲۵۹۔

نے ایسے ہی مسائل میں ترجیع اقامت میں اکہرے کلمات بسم اللہ میں جہر اور رفع یدین کو شمار کیا ہے۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

ورفع يديه عندالركوع والرفع منه وماروی عن الفساد فشاذ. 🗁

ترجمہ: رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے اٹھتے ہوئے رفع یدین سے نماز کا فاسد ہوجانا جو نقل کیا گیا ہے وہ شاذ ہے یعنی مشہور روایت کے خلاف ہے۔

غایۃ الاوطار میں لکھا گیا ہے:

"رفع یدین کرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی اور فساد کی روایت خلاف درایت و روایت ہے"۔ 🗎

کیا رفع یدین والی احادیث منسوخ ہیں؟

ان متعارض احادیث کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی دوسری صورت یہ ہے کہ رفع یدین کرنے اور نہ کرنے میں سے ایک سنت کو حضور s کا ابتدائی عمل تصور کیا جائے اور اسے منسوخ مانا جائے اور دوسرے کو حضور s کا آخری عمل اور ناسخ۔ اب سوال یہ ہے کہ کس حدیث کو ناسخ اور کس کو منسوخ سمجھا جائے؟ تو مختلف قرائن ہیں جو اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ رفع یدین نہ کرنے والی روایت ناسخ ہے اور رفع یدین والی روایتیں منسوخ۔

1 مسلم میں حضرت جابر بن سمرہ r سے روایت ہے کہ آپ s نے نماز میں رفع یدین کرتے ہوئے دیکھا تو ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا

🗁 ردالمحتار ۱/ ۴۵۹۔

🗎 غاية الاوطار جلد۱/ص: ۲۹۲۔

کہ گھوڑوں کے دم کی طرح ہاتھ کیوں اٹھاتے ہو؟............اس حدیث سے معلوم ہوا کہ چوں کہ پہلے رفع یدین کا حکم تھا اس لئے لوگ رفع یدین کیا کرتے تھے مگر پھر بعد کو یہ حکم منسوخ ہوگیا، اس لئے آپ s نے اس پر خفگی کا اظہار فرمایا۔

2 ان ابن زبیر رأی رجلاً یرفع عندالرکوع وعند رفع رأسه عنه، فنهاه عن ذلک وقال هذا رفعه رسول ثم ترکه.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن زبیر نے ایک شخص کو رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے رفع یدین کرتے دیکھا تو اس سے منع کیا اور فرمایا: یہ ایسا عمل ہے جس کو حضور s نے کیا تھا، مگر بعد کو ترک کر دیا تھا۔

3 حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ ابن مسعود جیسے صحابہ p جو اخیر تک حضور s کی خدمت میں رہے ہیں، کا معمول رفع یدین نہیں کرنے کا تھا۔

4 ابتداء اسلام میں نماز میں نسبتاً حرکت کی زیادہ اجازت تھی سلام کی اور چلنے کی ممانعت نہیں تھی۔ رفع یدین بھی ایک طرح کی حرکت ہے۔ ممکن ہے ابتدائی دور میں دوسرے افعال کی طرح اس کی بھی اجازت رہی ہو، بعد کو جب نماز میں اس طرح کی حرکتوں کی ممانعت کردی گئی تو رفع یدین کا طریقہ بھی آغاز نماز کی وقت کے سوا باقی نہ رہا۔

محققین احناف کا نقطۂ نظر:

انہیں وجوہ اور اسی قسم کے بعض دوسرے قرائن کی وجہ سے علامہ ابن ہمام، امام طحاوی اور متاخرین میں علامہ نیموی ا اور مولانا زکریا صاحب جیسے اہل

اوجز المسالک ۲/ ۲۰۶ بحوالہ تیسری الباری عن النهایه۔

علم کا خیال ہے کہ رکوع میں جاتے ہوئے اور اٹھتے ہوئے رفع یدین والی روایات منسوخ ہیں اور واقعہ ہے کہ اوپر اس کے لئے جو وجوہ ذکر کئے گئے ہیں ان کو سامنے رکھئے تو ان کی رائے بیجا نہیں۔ البتہ چوں کہ منسوخ ہونا یقینی نہیں، گمان کے درجہ میں ہے اس لئے اس عمل کو غیر مشروع نہیں کہا جاسکتا اور جو لوگ (شوافع وحنابلہ M) رفع یدین کو راجح خیال کرتے ہوں، ان کا عمل بھی درست ہے اور انشاء اللہ وہ اسی پر اجر کے حقدار ہوں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ رفع یدین کے بارے میں احادیث مختلف ہیں ایسی احادیث بھی ہیں جن میں صرف آغاز نماز میں رفع یدین کا ذکر ہے۔

اور ایسی روایات بھی ہیں جن کے مطابق ہر رکعت میں چھ یا سات دفعہ رفع یدین ثابت ہوتا ہے۔ حنفیہ اور مالکیہ صرف افتتاح نماز کے وقت رفع یدین کے قائل ہیں اور ہمارے زمانہ کے غیر مقلدین دوسری رکعت سے اٹھتے ہوئے بھی رفع یدین کے قائل ہیں۔ گویا فی الجملہ ان چار مواقع پر رفع یدین پر عمل ہے۔ افتتاح نماز کے وقت رفع یدین پر اتفاق ہے اور باقی تین صورتوں کے بارے میں اختلاف ہے۔

ان چار مواقع کو چھوڑ کر جن جن مواقع پر رفع یدین کا ذکر احادیث شریفہ میں موجود ہیں ان کو ذیل کے نقشہ سے سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ تمام روایات حضور s کے عمل مبارک سے متعلق ہیں۔ از راہِ اختصار راوی کے نام اور حوالہ کے اندراج پر اکتفا کیا جاتا ہے:

سجدہ سے پہلے:

حضرت ابوہریرہ r۔ (ابن ماجه: ۶۱)

حضرت وائل ابن حجر r۔ (ابوداؤد ۱/ ۱۰۵ دارقطنی ۱/ ۲۹۱)

حضرت عبداللہ ابن عمر r۔ (علامہ ہیثمی نے اس کی سند کو صحیح قرار

دیا ہے)۔ (مجمع الزوائد ۲/ ۱۰۲ . المحلی ۴/ ۹۳)

حضرت انس r۔ (علامہ ہیثمی نے اس کو بھی صحیح قرار دیا ہے)۔

(مجمع الزوائد ۲/ ۱۰۱ .دار قطنی ۱/ ۲۹۰)

حضرت عبداللہ ابن زبیر r۔

(ابو داؤد ۱/ ۱۰۸ . مسند امام احمد، الفتح الربانی ۳/ ۱۶۷)

دو سجدوں کے درمیان:

حضرت مالک ابن حویرث r۔ (المحلّٰی ۴/ ۹۲)

سجدہ کے بعد:

حضرت مالک ابن حویرث r۔

(مسند امام احمد، الفتح الربانی ۳/ ۱۶۷)

دوسرے سجدہ کے بعد:

حضرت ابوحمید ساعدی r۔ (ابن ماجه: ۶۱)

حضرت علی r۔

(طحاوی ۱/ ۱۳۱. دارقطنی ۱/ ۲۷۸، ابوداؤد ۱/ ۱۰۹)

حضرت عبداللہ ابن زبیر r۔ (اس روایت میں قیام کیلئے اٹھتے ہوئے بھی رفعِ یدین کا ذکر ہے)۔

(مسند امام احمد. الفتح الربانی ۳/ ۱۶۷ . حین ینهض للقیام)

ہر تکبیر کے ساتھ:

حضرت عبداللہ ابن عباس r۔ (ابن ماجه: ۶۱)

حضرت وائل بن حجر r۔ (ابوداؤد ۱/ ۱۰۵)

13

J:\2009\ZamZam\Rah-e-Aetidal\1st Proof Chp-3-ok ....(15-06-09)

First Proof	15-06-09
Second Proof	00-00-00
FINAL	00-00-00
TOTAL-PAGE	242-1st-proof

حضرت جابر بن عبداللہ r۔ (مجمع الزوائد ۲/ ۱۰۱)

حضرت انس r۔ (مجمع الزوائد ۲/ ۱۰۲)

حضرت عمیر ابن حبیب r۔ (ابن ماجه: ۶۱)

ہمیشہ بلندی سے پستی اور پستی سے بلندی کی طرف جاتے ہوئے:

حضرت عمیر ابن حبیب r۔ (ابن ماجه: ۶۱)

اب فی الجملہ اس قدر تو دونوں جماعتوں کے درمیان تسلیم شدہ ہے کہ آغاز اسلام میں رفعِ یدین کی متعدد صورتیں تھیں جن سے بعض کی تنسیخ عمل میں آچکی ہے۔ یہی اس بات کا قرینہ ہے کہ رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد بھی رفعِ یدین کی صورتیں ابتداء میں تھیں جو بعد کو منسوخ ہو گئیں۔

[ ]

نمازتراویح کی بیس رکعتیں

’’نمازِتراویح‘‘ کے مسنون ہونے پرعلماء کا اتفاق ہے،البتہ رکعات کی تعداد میں اختلاف ہے، امام ابوحنیفہ l، امام شافعی l، امام احمد l، اورامام ترمذی l کی تحقیق کے مطابق اکثر سلف صالحین کے نزدیک تراویح کی رکعات بیس(۲۰) ہیں، امام مالک l سے مختلف اقوال منسوب ہیں،مشہورقول(۳۶)رکعت کا ہے، لیکن اصل میں ان کے نزدیک بھی تروایح(۲۰)رکعت ہی ہے،ہرچاررکعت تراویح پرترویحہ میں مزید چاررکعت نفل کا معمول مدینہ میں تھا،اس لئے (۱۶) رکعتوں کے اضافہ کے ساتھ(۳۶)رکعتیں ہوگئیں،اس کے علاوہ حرمین شریفین میں آج تک بیس رکعات کا معمول ہے اوریہی معمول حضرت ابوبکر r کے علاوہ خلفاءِثلاثہ حضرت عمرفاروق حضرت علی اورحضرت عثمان p کے زمانہ میں رہاہے۔

تراویح کی رکعات کی تعیین میں اہلِ علم کے درمیان جواختلاف واقع ہواہے،اس کی دوبنیادی وجوہ ہیں،اول یہ کہ رسول اللہ s کامعمول ہمیشہ تراویح کی جماعت کانہیں رہا،چنددنوں آپ s نے جماعت کااہتمام کیا پھراس اندیشہ سے کہ کہیں

شرحِ مهذب۔ ٣٢/٤۔

المغنی: ٤٥٦/١۔

ترمذی ١٩٦/١، باب ماجاء فی قیام شهر رمضان۔

المدونة الکبریٰ ١٩٢/١۔ زرقانی علی المؤطا ٢٣٩/١۔

اثار السنن ٥٢/٢۔ ٥١۔

واجب نہ ہوجائے جماعت کا سلسلہ ختم کردیا اس لئے نماز تراویح اوراس کی رکعات سے متعلق احادیث کم ہیں بلکہ اکابرصحابہ p سے اس بارے میں حضور s کا کوئی معمول منقول نہیں ہے،صحیح روایت صرف حضرت سائب بن یزید r کی ہے جن کی عمرحضور s کے وصال کے وقت سات آٹھ سال سے زیادہ......نہ تھی،اس لئے جماعت کا سلسلہ ختم ہوجانے کے بعد تنہا نماز پڑھتے ہوئے حضور s کا معمول کیا تھا؟اس سلسلہ میں حدیثوں سے کوئی قطعی بات واضح نہیں ہوتی ہے۔اس اختلاف کی دوسری وجہ یہ ہے کہ حدیث میں تراویح کوبھی’’قیام لیل‘‘ سے تعبیرکیا گیاہےاورتہجدکوبھی،اس سے اشتباہ پیداہوجاتاہے۔

بیس(۲۰)رکعات سے متعلق احادیث وآثار:

جن روایات سے تراویح کی بیس رکعات معلوم ہوتی ہیں،وہ اس طرح ہیں:

1 ان رسول اللّٰه كان يصلى فى رمضان عشرين ركعة والوتر.

ترجمہ: رسول اللہ s رمضان میں بیس(۲۰) رکعت اور وتر کی نماز ادا فرماتے تھے۔

اس روایت کی سند میں ایک راوی ابراہیم بن عثمان ہیں جن کومحدثین نے ضعیف قراردیاہے،اس لئے یہ روایت بہ اعتبارسند کے ضعیف ہے،البتہ مختلف صحابہ سے بیس رکعتیں تراویح پڑھنا ثابت ہےاورثابت ہے کہ حضراتِ صحابہ p سے ۲۰/رکعات کامعمول ہے،چنانچہ:

2 كان الناس يقومون فى زمان عمر بن الخطاب فى

ترمذی ١٦٦/١، باب ماجاء فی قیامِ شهر رمضان۔

مصنف ابن ابی شیبه ٣٩٤/٢۔ بیهقی ٤٩٦/٢ وطبرانی عن ابن عباس q۔

رمضان بثلاث وعشرين ركعة.

ترجمہ: حضرت عمر ابن خطاب r کے زمانہ میں لوگ رمضان المبارک میں تیئس (۲۳) رکعتیں (۲۰/تراویح، ۳/وتر) کا اہتمام کرتے تھے۔

یہ روایت صحیح سند سے ثابت ہے، البتہ مرسل ہے جو احناف، مالکیہ اور اکثر محدثین کے نزدیک حجت ہے۔

3 ان عمر بن الخطاب امر رجلا يصلى بهم عشرين ركعةً.

ترجمہ: عمر بن خطاب r نے ایک شخص کو حکم دیا کہ لوگوں کو بیس رکعت (تراویح کی) نماز پڑھائیں۔

اس کی سند بھی قوی ہے البتہ روایت مرسل ہے۔

4 كان ابى بن كعب يصلى بالناس فى رمضان بالمدينة عشرين ركعةً ويوتر بثلاثٍ.

ترجمہ: ابی بن کعب r مدینہ منورہ میں لوگوں کو ماہِ رمضان میں ۲۰/رکعت تراویح اور تین رکعت وتر کی نماز پڑھاتے تھے۔

یہ حدیث مرسل ہے اور اس کی سند بھی قوی ہے۔

5 عن السائب بن يزيد قال كنا ننصرف من القيام علٰى عهد عمر وقد دنافروع الفجر وكان القيام علٰى عهد عمر ثلاثة وعشرين ركعة.

مؤطا امام مالك مع الزرقانى عن يزيد بن رومان ۲۳۹/۱۔ بيهقى ۴۹۶/۲۔

مصنف ابن ابى شيبه عن يحيٰى بن سعيد ۳۹۳/۲۔

ابن ابى شيبه عن عبدالعزيز بن رفيع: ۳۰۳/۲۔

مصنف عبدالرزاق ۲۶۱/۴، بيهقى ۴۹۶/۲۔

ترجمہ: سائب بن یزید r سے روایت ہے کہ ہم لوگ حضرت عمر r کے زمانہ میں قیامِ لیل سے فارغ ہوتے تو فجر کا وقت قریب ہوتا اور قیامِ لیل حضرت عمر r کے زمانہ میں تیئس (۲۳) رکعت ہوتا تھا۔ (یعنی ۲۰/رکعت تراویح اور ۳/رکعت وتر)۔

امام نووی ا نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

6 عن الحسن قال كانوا يقرؤن بتسع وثلاثين او احدىٰ واربعين ركعة.

ترجمہ: حسن ا سے روایت ہے کہ لوگ (تراویح) انتالیس یا اکتالیس رکعتیں پڑھتے تھے (یعنی ۲۰/رکعت تراویح، ۱۶/رکعت نفل ۳/رکعت وتر اور دو رکعت نفل)۔

7 عن ابى الحسناء ان عليًا امر رجلا يصلى به فى رمضان عشرين ركعة.

ترجمہ: حضرت علی r نے ایک شخص کو حکم دیا کہ رمضان میں بیس رکعت نماز پڑھائیں۔

ابوعبدالرحمٰن سلمی حضرت علی r سے روایت کرتے ہیں:

8 دعا القراء فى رمضان فامر منهم رجلا يصلى بالناس عشرين ركعة، قال وكان على رضى اللّٰه عنه يوتر بهم.

نصب الرأية ۱۵۴/۲۔

مصنف عبدالرزاق: ۲۶۱/۴۔

مصنف ابن ابى شيبه ۳۹۲/۲، بيهقى ۴۹/۲۔

سنن بيهقى: ۴۹۶/۲۔

ترجمہ: حضرت علی r نے رمضان میں قاریوں کو بلایا اور ان میں سے ایک صاحب کو حکم دیا کہ لوگوں کو بیس رکعت نماز پڑھائیں، ابوعبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ حضرت علی r لوگوں کو وتر پڑھاتے تھے۔

9 کـان یـؤمـنـا سـویـد بـن غفلة فی رمضان فیصلی خمس ترویحات عشرین رکعة.

ترجمہ: سوید بن غفلہ r رمضان کے مہینے میں ہماری امامت کرتے تھے اور پانچ ترویحہ یعنی بیس رکعت تراویح کی نماز پڑھاتے تھے۔

تابعین اور تبعِ تابعین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد صحابہ اور عہدِ تابعین کا عام معمول یہی تھا۔

- عـن عـطـاء قـال ادرکت الناس وهم یصلون ثلاثا وعشرین رکعة بالوتر.

ترجمہ: حضرت عطاء l سے منقول ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے لوگوں کو وتر کے ساتھ تیئیس (۲۳) رکعت نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔

q کـان سعیـد بن جُبَیر یؤمنا فی شهر رمضان فکان یـقـرأ بـالقراء تین جمیعًا، یقرأ لیلة بقراء ة ابن مسعود فکان یصلی خمس ترویحات فاذا کان العشر الاواخر کان یصلی ست ترویحاتٍ.

ترجمہ: سعید بن جبیر r رمضان کے مہینے میں ہماری امامت کرتے

سنن بیهقی عن ابی الخصیف: ۴۹۶/۲۔

ابن ابی شیبه ۳۹۳/۲۔

مصنف ابن ابی شیبه: ۳۹۳/۲۔

تھے اور دو طرح کی قرأت کرتے، رات میں ابن مسعود r کی قرأت کے مطابق قرأت کرتے اور پانچ ترویحے کی نماز (یعنی ۲۰ رکعت پڑھاتے) اور جب رمضان کا آخری عشرہ ہوتا تو چھ (۶) ترویحے کی نماز پڑھاتے۔

w عـن ابی البختری انه کان یصلی خمس ترویحات فی رمضان ویوتر بثلاث.

ترجمہ: ابوالبختری l رمضان میں پانچ ترویحہ کے ساتھ نماز پڑھاتے تھے اور پھر تین رکعت وتر۔

علامہ نیموی l نے ان روایتوں کی سند کو ''حسن'' کا درجہ دیا ہے۔

e کـان ابـن ابـی مـلیـکـه یـصـلـی بنافی رمضان عشرین رکعة.

ترجمہ: ابن ابی ملیکہ l، ماہِ رمضان میں ہمیں بیس رکعت نماز پڑھاتے تھے۔

r ان عـلـی ابـن ربیـعـه کـان یصلی بهم فی رمضان خمس ترویحات ویوتر بثلاث.

ترجمہ: علی ابن ربیعہ l رمضان المبارک میں پانچ ترویحہ کی نماز یعنی بیس رکعت تراویح اور تین رکعت وتر پڑھاتے تھے۔

اس کے علاوہ اور ضعیف روایات بھی ہیں۔

t عـن داؤد ابـن قیـس قال ادرکت الناس بالمدینة

حوالۂ سابق۔

مصنف ابن ابی شیبه عن نافع عن ابن عمر: ۳۹۳/۲۔

مصنف ابن ابی شیبه عن سعید بن عبید: ۳۹۳/۲۔

في زمن عمر بن عبدالعزيز وابان ابن عثمان يصلون ستة وثلاثين ركعة ويوترون بثلاثٍ. 🗀

ترجمہ: داؤد بن قیس کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز اور ابان بن عثمان کے زمانہ میں مدینہ منورہ میں لوگوں کو چھتیس (۳۶) رکعت تراویح اور پھر تین رکعت وتر پڑھتے ہوئے دیکھا۔

شتیر بن شکر حضرت علی r کے اصحاب میں سے ہیں، ان کے بارے میں منقول ہے:

y كان يؤمهم في شهر رمضان بعشرين ركعة ويوتر بثلاث.

ترجمہ: رمضان کے مہینے میں بیس رکعت تراویح اور تین رکعت وتر پڑھاتے۔

بیہقی نے اس حدیث کو قوی قرار دیا ہے۔ 🗎

پھر یہ بات بھی ملحوظ رکھی جائے کہ صحابہ p اور اس کے بعد کے اَدوار میں تین شہر علوم اسلامی کے اور بالخصوص فنِ حدیث کے مراکز رہے ہیں، مکہ، مدینہ اور کوفہ، امام شافعی l کا ابتدائی دور مکہ میں گذرا، امام مالک l نے پوری زندگی مدینہ میں گذاری اور امام ابوحنیفہ l نے کوفہ میں آنکھ کھولی اور زیادہ تر یہیں محدثین سے استفادہ کیا اسی لئے امام ابوحنیفہ l کی فقہی آراء زیادہ تر علماءِ کوفہ کی رائے پر مبنی ہے جو متوارثاً حضرت علی r، حضرت عبداللہ ابن مسعود r وغیرہ سے آرہی تھیں۔ امام مالک کے یہاں اہل مدینہ کے تعامل کو خصوصی اہمیت حاصل ہے کیوں کہ یہ تعامل عہدِ صحابہ سے نسلاً بعد نسلٍ آرہا تھا، امام شافعی l عام طور پر علماءِ مکہ کی آراء کی طرف جھکاؤ رکھتے ہیں اور علماء مکہ

🗀 حوالۂ سابق۔

🗎 السنن البيهقي ۴۹۶/۲۔ نیز دیکھئے: (مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۹۳/۲)۔

عام طور پر حضرت عبداللہ ابن عباس q اور ان کے تلامذہ کی احادیث اور فتاویٰ کو اپنے عمل کی بنیاد بنایا کرتے تھے۔

اب غور کیجئے تو ان تینوں مراکزِ علمی کا معمول بیس رکعت تراویح کا رہا ہے کیوں کہ حضرت عبداللہ ابن عباس q کے شاگردِ خاص سعید بن جبیر کے بارے میں گذر چکا ہے کہ بیس رکعت پڑھا کرتے تھے، علماء مکہ میں عطاء بن ابی رباح کا بیان گذر چکا ہے کہ ان کے عہد میں ۲۰/رکعت کا معمول تھا اور ابن ابی ملیکہ تو خود ہی ۲۰/رکعتیں پڑھایا کرتے تھے اور خود امام شافعی l کا بیان ہے کہ میں نے اپنے شہر مکہ میں لوگوں کو بیس رکعت پڑھتے ہوئے پایا ہے **وهكذا ادركت ببلدنا مكة يصلون بعشرين ركعة.** 🗀

مدینہ منورہ میں آپ نے دیکھا کہ حضرت عمر ہی کے عہد سے ۲۰/رکعت تراویح کا تعامل تھا، حضرت علی r بھی ۲۰/رکعتوں کا حکم دیتے تھے اور امام مالک l نے اپنے عہد تک یہی تعامل پایا، یہی وجہ ہے کہ مدینہ میں ۲۰/رکعت تراویح ہوتی تھی، اور ہر ترویحہ پر چار چار رکعت نفل پڑھی جاتی تھی اور پھر تین رکعت وتر اور وتر کے بعد کی دو رکعت نفل، اس طرح اکتالیس رکعتیں ہوجاتی تھیں، امام ترمذی l نے اکتالیس والا قول نقل کر کے لکھا ہے کہ یہی اہلِ مدینہ کا قول ہے اور اسی پر ان کا عمل ہے۔ **وهو قول اهل المدينة والعمل علىٰ هٰذا عنده بالمدينة.** 🗎

جہاں تک کوفہ کی بات ہے تو حضرت علی r کا معمول گذر چکا ہے کہ ان کے عہد میں ۲۰/رکعت تراویح پڑھی جاتی تھی، اسود بن یزید جو کوفہ کے کبار فقہاء و

🗀 ترمذی ۱۶۶/۱۔ نیز دیکھئے: مختصر قیام اللیل للمروزی: ۹۶۔

🗎 ترمذی ۱۶۶/۱، نیز ملاحظہ ہو: مختصر قیام اللیل للمروزی ۹۶۔

محدثین میں تھے، ۴۰ رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ سوید بن غفلہ r جو اکابرِ تابعین میں ہیں، ان کا معمول گذر چکا ہے کہ ۲۰ رکعت کا تھا اور حارثِ اعور ا جو حضرت علی r کے تلامذہ میں ہیں وہ بھی ۲۰ رکعتیں پڑھایا کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ امام ابوحنیفہ ا نے بھی اہلِ کوفہ کے تعامل کو ہی دیکھتے ہوئے بیس رکعت والی روایت کو ترجیح دیا ہوگا۔

لہٰذا گو رسول اللہ s سے تراویح کی تعداد صحیح طور پر ثابت نہیں اور بیس رکعت والی روایت بھی ضعیف ہے لیکن عہدِ صحابہ سے ائمہ مجتہدین اور حضرات اکابر محدثین کے عہد تک بیس رکعتوں کا معمول رہا ہے اور اہلِ علم اس بات سے واقف ہیں کہ اگر کوئی حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف ہو اور فقہاء و محدثین اور علماءِ راسخین نے عام طور پر اس کو قبول کرلیا ہو تو وہ حدیث مقبول ہوتی ہے، اسی کو ''تلقی بالقبول'' کہا جاتا ہے۔

مشہور محدث علامہ جلال الدین سیوطی ا کا بیان ہے:

یحکم للحدیث بالصّحة اذا تلقاه الناس بالقبول وان لم یکن له اسناد صَحیح.

ترجمہ: جس حدیث کو لوگوں (اہلِ علم) نے قبول کرلیا ہو گو اس کی کوئی سند نہ ہو پھر بھی اس حدیث کے صحیح ہونے کا حکم لگایا جائے گا۔

حافظ ابن حجر نے حدیث کے مقبول ہونے کے اسباب پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

ان یتفق العلماء علی العمل به بمدلول حدیث فانه

تحفة الاحوذی ۷۳/۲۔

تدریب الراوی ۲۴۔

یقبل حتی یجب العمل به وقد صرح بذلک جماعة من ائمةِ الاصُول.

ترجمہ: علماءِ کرام کسی حدیث پر عمل کی بابت متفق ہو جائیں تو اسے قبول کیا جائے گا اور اس پر عمل کرنا واجب ہوگا، ائمۂ اصول کی ایک جماعت نے اس کی تصریح کی ہے۔

حافظ سخاوی لکھتے ہیں:

وکذا اذا تلقت الامة الضعیف بالقبول یعمل به علی الصحیح حتی انهٔ ینزل منزلة المتواتر حتی انهٔ ینسخ المقطوع به.

ترجمہ: جب کسی ضعیف حدیث کو امت میں مقبولیت کا درجہ حاصل ہو جائے تو صحیح قول کے مطابق اس پر عمل کیا جائے گا حتیٰ کہ اسے خبرِ متواتر کے درجہ میں رکھا جائے گا اور اس سے قطعی خبر کو منسوخ بھی کیا جا سکے گا۔

یہ حدیث کہ ''وارث کے لئے وصیت معتبر نہیں'' محدثین کے یہاں ان احادیث میں ہے جن کا صحیح ہونا محلِ نظر ہے لیکن امام بخاری ا نے اس کو قبول کیا ہے، کیونکہ اہلِ علم نے اس کو عمل کے لئے قبول کیا ہے۔

اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ایسی بات جس کی دین میں اصل نہ ہو، جس کا کوئی ثبوت نہ ہو، اس کا اسلام کے ان ادوار میں مقبول و معمول بن جانا ناقابلِ تصور ہے جن کے بہتر ہونے کی خود آپ s نے شہادت دی ہے، جس میں آپ s کے صحبت یافتہ اور آپ s کے فیض یافتگان کے رفقاء واصحاب موجود ہوں، پھر

الاجوبة الفاضله ۲۳۱، بحواله الافصاح علی نکت ابن الصلاح۔

فتح المغیث ۲۱۔ ۱۲۰۔

مسائل ایسے ہوں جن میں اپنی طرف سے کم وبیش کرنے کی کوئی گنجائش نہ ہو اور کمی و زیادتی بدعت ہو اور بدعت پر نکیر اور اس کو روکنے کی سعی وکوشش ضروری ہے، تو کیا یہ صحابہ اور اجلۂ تابعین و تبع تابعین ایک بدعت اور منکر پر متفق ہو گئے تھے بلکہ خود ان کے مرتکب تھے اور ان کا ایمان اتنا کمزور تھا کہ کوئی ٹوکنے والی زبان اور روکنے والا ہاتھ نہ تھا اور نعوذ باللہ وہ ہم جیسوں سے بھی گئے گذرے تھے جو اپنے زعم وخیال کے مطابق ایک خلافِ سنت طریقۂ نماز کی مخالفت پر کمر بستہ تھے............؟ اس لئے عہدِ صحابہ سے امت میں کسی بات کا تعامل اتنی بڑی دلیل ہے کہ اس کے مقابلہ میں اگر بخاری و مسلم کی بھی کوئی روایت ہو تو اس کو ترجیح نہ ہوگی اور اس کی ایسی توضیح کی جائے گی کہ وہ اس تعامل سے نہ ٹکراتا ہو، اسی لئے ۸؍رکعت والی روایت کو تہجد سے متعلق تصور کیا جائے گا اور ۲۰؍رکعت تراویح کے تعامل پر عمل کیا جائے گا۔

خلفائے راشدین کی سنت:

پھر یہاں ہمیں خصوصیت سے اس فرمانِ رسالت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے:

فانه من يعيش منكم بعدى فيرى اختلافًا كثيرًا فعليكم بسُنتى وسنة الخلفاء الراشدين المهديين تمسكوا بها وعضوا عليها بالنواجذ واياكم ومحدثات الامور. 🗁

ترجمہ: تم میں سے جو کوئی میرے بعد زندہ رہے وہ بہت سے اختلافات کو دیکھے گا، اس وقت تم پر لازم ہوگا کہ میری سنت اور ہدایت یافتہ خلفاءِ راشدین کی سنت پر عمل کرو اور اسے مضبوطی سے تھام لو اور دانت سے مضبوط پکڑ لو یعنی اس پر سختی سے عمل

🗁 مسند احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجه عن عرباض بن ساريه۔

پیرا رہو، اور (دین میں) پیدا ہونے والی نئی نئی چیزوں سے خوب بچو۔

اس روایت نے دونوں باتیں واضح کر دیں، یہ بھی کہ آپ s کے خلفائے راشدین اور اصحاب کی سنت بھی قابلِ اتباع و پیروی ہے اور یہ دراصل بالواسطہ آپ s ہی کی پیروی ہے، اور اس طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ اس پر عمل کو بدعت قرار نہیں دیا جا سکتا............اور گذر چکا کہ خلفائے راشدین میں حضرت عمر وحضرت علی q کا معمول تو ۲۰؍رکعتوں کا تھا ہی، بعض روایات میں حضرت عثمان کا بھی ذکر ہے۔ اس کے باوجود اس کا انکار اور انکار پر اصرار کیسی جسارت کی بات ہے؟......

جو لوگ تراویح کو آٹھ (۸) رکعت قرار دیتے ہیں، ان کی اصل دلیل حضرت عائشہ R کی روایت ہے کہ آپ s رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے🗁 ظاہر ہے ان میں آٹھ (۸) رکعت اصل نماز ہوتی تھی اور تین رکعت وتر............اس حدیث کے صحیح ہونے میں کوئی کلام نہیں، لیکن ظاہر ہے کہ اس سے ایسی نماز مراد ہے جو رمضان اور غیر رمضان دونوں میں پڑھی جاتی ہو اور وہ نمازِ تہجد ہے، نمازِ تراویح اس سے مراد نہیں، تراویح اور تہجد دونوں الگ الگ نمازیں ہیں، تراویح ابتداء شب میں پڑھی جاتی ہے اور تہجد آخر شب میں، اس لئے اس روایت سے آٹھ رکعت تراویح پر استدلال کرنا درست نظر نہیں آتا۔

پھر حضرت عائشہ R کی روایت میں الفاظ اس طرح ہیں:

يصلى اربعًا فلا تسئل عن حسنهن وطولهن ثم يصلى اربعًا فلا تسئل عن حسنهن وطولهن. 🗎

ترجمہ: حضور s چار رکعت نماز اس طرح پڑھتے کہ اس کے حسن اور طول کا کیا پوچھنا، پھر اسی طرح چار رکعت پڑھتے، اس کا حسن اور طول بھی کیا ہی خوب ہوتا۔

🗁 بخاری ۱/۱۵٤۔

🗎 بخاری ۱/۱۵٤۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ آپ s نے اس طرح ۸ رکعتیں ادا کیں کہ چار چار رکعت پر سلام پھیرا، سرخیل علماء غیر مقلدین مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری کو بھی اعتراف ہے کہ یہ چار چار رکعتیں ایک سلام کے ساتھ تھیں۔ [1]

ان حضرات کی دوسری دلیل حضرت سعد بن یزید کی ایک روایت میں مذکور ہے کہ حضرت عمر r نے حضرت ابی بن کعب r اور تمیم داری r کو گیارہ رکعت یعنی آٹھ رکعت تراویح اور تین رکعت وتر پڑھانے کا حکم دیا تھا، اس روایت کو امام مالک l نے بھی مؤطا میں نقل کیا ہے، لیکن حافظ ابن عبدالبر کا خیال ہے کہ اس روایت میں وہم ہوگیا ہے، کیوں کہ اکثر روایتوں میں بیس رکعتوں کا ذکر ہے، اور مولانا محمد زکریا صاحب l کا خیال ہے کہ یہ وہم روایت کے ایک راوی محمد بن یوسف سے پیش آیا ہے۔ [2]

اگر اس روایت کو صحیح مان لیا جائے تو یوں تطبیق دی جاسکتی ہے کہ حضرت عمر r کے دور میں تراویح اور تہجد دونوں کی جماعت کا معمول تھا، آپ r نے تراویح کے لئے ۲۰ رکعت کا حکم دیا ہوگا اور تہجد کے لئے آٹھ رکعت کا، جس کی تائید روایت کے ان الفاظ سے ہوتی ہے:

نعم البدعة هذه والتی تنامون عنها افضل من التی تقومون. یرید اٰخر اللیل کانوا یقومون فی اول اللیل. [3]

ترجمہ: یہ کیا ہی بہتر نیا طریقہ ہے اور وہ نماز جسے تم سونے کی نذر کردیتے ہو یعنی اخیر شب کی نماز وہ بہتر ہے اس نماز سے جسے تم انجام دیتے ہو، واضح ہو کہ عام لوگ اولِ شب ہی میں نماز پڑھنے کا اہتمام کرتے تھے۔

[1] تحفة الاحوذی ۳۳۱/۱۔
[2] دیکھئے: اوجز المسالك ۹۵/۱ـ ۳۹۴ـ
[3] مصنف عبدالرزاق ۲۵۹/۴ـ

میرے اس نقطۂ نظر کی تائید حضرت سائب بن یزید r کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو محدث ابوعبداللہ، محمد بن نصر مروزی (م: ۲۹۴ھ) نے نقل کیا ہے کہ:

كنا نصلی فی زمن عمر بن الخطاب فی رمضان ثلٰث عشرة ركعة ولكن واللّٰه ماكنا نخرج الا فی وجاه الصبح. [1]

ترجمہ: ہم لوگ رمضان المبارک میں حضرت عمر بن خطاب r کے زمانہ میں تیرہ رکعت نماز پڑھتے تھے، لیکن بہ خدا ہم لوگ سورج طلوع ہونے کے قریب ہی نکلتے۔

اس روایت سے واضح ہے کہ آٹھ رکعت فجر سے کچھ پہلے ادا کی جاتی تھی گویا یہ نماز تہجد تھی، نہ کہ تراویح، کیونکہ تراویح تورات کے ابتدائی حصہ میں ادا کی جاتی ہے۔

اس لئے صحیح یہی ہے کہ بیس رکعت تراویح مسنون ہے، ۸ رکعت تراویح کی کوئی صریح روایت موجود نہیں، یہی عہدِ صحابہ سے لے کر فقہاء و محدثین اور سلفِ صالحین کے دور تک ہمیشہ کا معمول رہا ہے اور حرمین شریفین میں بھی اب تک ہی بیس رکعت ادا کی جاتی ہے، حضرات صحابہ کرام p، تابعین و تبع تابعین اور سلف صالحین ایک ایسی بات پر متفق نہیں ہوسکتے جس کی کوئی اصل نہیں، اس کو بدعت یا فقہاء کی اختراع کہنا نہایت جسارت کی بات ہے، بیس رکعت میں آٹھ رکعتیں بھی شامل ہیں، اس طرح اگر آٹھ رکعت والی روایتوں کو تہجد نہ سمجھا جائے جب بھی آٹھ والی روایت پر بھی عمل ہوجاتا ہے، اس لئے اسی میں زیادہ احتیاط اور اتباعِ سنت کا لحاظ ہے۔

وَباللّٰهِ التوفيق وَهو المستعَان.

[1] مختصر قیام اللیل و قیام رمضان: ۹۵۔

مردوں اور عورتوں کی نماز میں فرق

خواتین کے بارے میں شریعت کا عمومی مزاج یہ ہے کہ ہر کام میں حتی الامکان ستر وحجاب سے کام لے، جن کاموں میں بے حجابی کا اندیشہ تھا وہاں عورتوں کے لئے استثنائی احکام رکھے گئے ہیں۔ مردوں پر جہاد فرض ہے عورتوں پر جہاد فرض نہیں، بلکہ آپ s نے تو حج ہی کو ان کا جہاد قرار دیا🗀 جمعہ وعیدین اور جماعت کے واجبات سے وہ مستثنیٰ ہیں، نہ وہ امام ہوسکتی ہیں نہ مؤذن۔ ان کے لئے گھر پر نماز پڑھنا مسجد میں پڑھنے سے بہتر ہے 🗎 مسجد آہی جائیں تو ان کی صف سب سے آخر رکھی گئی۔ پہلے مرد پھر بچے، اس کے بعد عورتیں، اس لئے فقہاء نے نماز کی کیفیت وہیئت میں بھی مرد وعورت میں کسی قدر فرق رکھا ہے اور کوشش کی ہے کہ عورتیں ایسا طریقہ اختیار کریں کہ اس میں زیادہ ستر وحجاب کی رعایت ہو۔

یہی حضرات فقہاء اور محدثین کا مسلک ہے اور اکثر اہلِ علم اسی کے قائل ہیں۔ ائمہ اربعہ اس پر متفق ہیں 🗎 علامہ دردیر مالکی l نے آدابِ مسجد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حالتِ سجدہ میں پیٹ رانوں، کہنیاں گھٹنوں اور بازو پہلو سے الگ رہنے چاہئے۔ لیکن عورتیں ان سب کو ملا کر اور سمیٹ کر رکھیں، اس طرح قعدہ میں مردوں کو رانیں کسی قدر علٰحدہ رکھنی چاہئے، .... مگر عورتوں کو ملا کر ہی

🗀 مشکوٰۃ ۲۲۱/۱۔

🗎 دیکھئے: بیہقی ۱۳۱/۳، فتح الباری ۳۵۰/۳۔

🗎 الشرح الصیغر ۳۲۹/۱۔

رکھنا چاہئے🗀 فقہائے شوافع وحنابلہ نے بھی مختلف کیفیات خصوصاً رکوع وسجود اور قعدہ میں مرد وعورت کے طریقے مختلف رکھے ہیں 🗎 نیز مصنف ابن ابی شیبہ اور مصنف عبدالرزاق کی روایات سے واضح ہے کہ عطاء، مجاہد، حماد، ابراہیم نخعی، حسن بصری، ابن شہاب زہری، قتادہ، ابن جریج اور صحابہ p میں حضرت علی r کی رائے بھی یہی ہے۔

سلف صالحین کی یہ رائے جہاں عورتوں سے متعلق اسلامی تعلیمات کی روح سے ہم آہنگ ہے وہیں اس پر متعدد احادیث، نیز صحابہ اور تابعین کے فتاوے بھی شاہد ہیں، جو ظاہر ہے کہ عہدِ نبوی s سے قرب کی وجہ سے سنتوں سے زیادہ واقف اور آگاہ تھے۔ چنانچہ:

حضرت وائل بن حجر r سے مروی ہے:

1 قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا وائل بن حجر اذا صلیت فاجعل یدیک حذاء اذ نیک والمرأۃ تجعل یدیھا حذاء ثدییھا. 🗎

ترجمہ: مجھے رسول اللہ s نے فرمایا اے وائل بن حجر جب تم نماز پڑھو تو اپنے دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھاؤ اور عورت اپنے دونوں ہاتھ اپنے سینہ کے برابر اٹھائے۔

حضرت جابر بن عبداللہ r سے مروی ہے:

2 زجر النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان تصل المرأۃ برأسھا شیئًا. 🗐

🗀 الشرح الصغیر ۳۳۰/۱۔

🗎 متن الغایۃ والتقریب: ۷٤۔ ۷۲۔ المغنی ۳۲۹/۱۔

🗎 طبرانی کبیر ۱۸/۲۲۔

🗐 مصنف عبدالرزاق ۱۳۸/۳۔

ترجمہ: آپ s نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ عورت اپنا ہاتھ کچھ بھی سرتک لے جائے۔

3 عن زید بن ابی حبیب انه صلی اللّٰه علیه وسلم مرّ علی امرأتین تصلیان فقال اذا سجدتما فضما بعض اللحم الی الارض فان المرأة فی ذلک لیست کالرجل. 🗁

ترجمہ: زید بن ابی حبیب سے مروی ہے کہ رسول اللہ s دو عورتوں کے پاس سے گذرے جو نماز پڑھ رہی تھیں، آپ s نے فرمایا جب تم سجدہ کرو تو اپنے جسم کا کچھ حصہ زمین سے ملالیا کرو کیونکہ عورت کا حکم (سجدہ کی حالت میں) مرد کی طرح نہیں ہے۔

حضرت ابوسعید خدری r سے مروی ہے کہ رسول اللہ s نے فرمایا:

4 خیر صفوف الرجال الاول وخیر صفوف النساء الصف الآخر. وکان یأمر الرجال ان یتجافوا فی سجودهم ویأمر النساء یتخفضن فی سجودهن وکان یأمر الرجال ان یفرشوا الیسریٰ وینصبوا الیمنیٰ فی التشهد ویأمر النساء ان یتربعن. 🗎

ترجمہ: مردوں کی بہترین صف پہلی صف اور عورتوں کی بہترین صف آخری صف ہے۔ آپ s مردوں کو حکم فرمایا کرتے تھے کہ سجدہ کی حالت میں اپنے اعضاءِ جسم الگ الگ کرکے رکھیں اور عورتوں کو پست ہوکر سجدہ کرنے کا حکم فرماتے

🗁 مراسیل ابی داؤد: ص۸۔ بیهقی: ۲۲۳/۲۔

🗎 سننِ بیهقی ۲۳/۲۔ ۲۲۲۔

تھے، مردوں کو حکم فرماتے تھے کہ تشہد میں دایاں پاؤں اٹھائیں اور بایاں پاؤں بچھائیں اور عورتوں کو حکم فرماتے تھے کہ چہارزانو ہوکر بیٹھیں۔

حضرت عبداللہ ابن عمر r سے روایت ہے کہ رسول اللہ s نے فرمایا:

5 اذا جلست المرأة فی الصَّلوة وضعت فخذها علیٰ فخذها الاخریٰ واذا سجدت الصقت بطنها فی فخذها کاستر مایکون لها وان اللّٰه تعالیٰ ینظر الیها ویقول: یاملائکتی اشهدکم انی قد غفرت لها. 🗁

ترجمہ: جب عورت نماز میں بیٹھے تو اپنی ایک ران دوسری ران پر رکھے اور سجدہ کرے تو پیٹ کو رانوں سے چپکالے تاکہ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ پردہ ہوجائے اللہ تعالیٰ اس عورت کی طرف نظرِ رحمت فرماتے ہیں اور ارشاد فرماتے ہیں کہ اے فرشتو! میں تمہیں اس پر گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اسے بخش دیا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عمر r کے بارے میں مروی ہے کہ:

6 سئل کیف کان النساء یصلین علیٰ عهد رسول اللّٰه s. قال: کن یتربعن ثم أمرن ان یحتفزن (یعنی یستوین جالسات علی اوراکهن). 🗎

ترجمہ: آپ r سے دریافت کیا گیا کہ رسول اللہ s کے عہد میں خواتین کس طرح نماز ادا کرتی تھیں؟ آپ r نے فرمایا، چہارزانو بیٹھ کر پھر انہیں حکم دیا گیا کہ خوب سمٹ کر بیٹھا کریں۔

🗁 حوالۂ سابق: ۲۲۳/۲۔

🗎 جامع المسانید ۴۰۰/۱۔

حضرت علی r سے مروی ہے کہ آپ r نے فرمایا:

7 اذا سجدت المرأة فلتحتفز ولتضم فخذيها.

ترجمہ: عورت کو خوب سمٹ کر اور دونوں رانوں کو ملا کر سجدہ کرنا چاہئے۔

حضرت عبداللہ بن عباس r کے بارے میں مروی ہے کہ آپ r سے عورتوں کی نماز کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا:

8 تجتمع وتحتفز.

ترجمہ: یعنی عورت خوب سمٹ کر اور اپنے جسم کو ملا کر نماز ادا کرے۔

اس کے علاوہ اجلۂ تابعین ابراہیم نخعی، مجاہد اور عطاء M وغیرہ سے بھی اس طرح کے فتاویٰ منقول ہیں۔ چنانچہ شریعت کی اسی روح کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت امام شافعی کا ارشاد ہے:

"وقد ادب اللّٰہ تعالٰی النساء بالاستتار وادبھن بذلک رسُول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم واحب للمرأة فی السجود ان تضم بعضها الٰی بعض وتلصق بطنها بفخذيها وتسجد کاستر مایکون لها وھٰکذا احب لها فی الرکوع والجلوس وجمیع الصّلوة ان تکون فیها کاستر مایکون لها".

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو یہ ادب سکھلایا ہے کہ وہ پردہ کریں اور یہی اللہ کے رسول s نے بھی سکھلایا ہے اور عورتوں کے لئے سجدہ میں بہتر ہے کہ وہ اپنے

مصنف ابن ابی شیبہ ۲۷۹/۱۔ سنن بیہقی ۲۲۲/۲۔

مصنف ابن ابی شیبہ ۲۷۰/۱۔ مصنف عبدالرزاق ۱۳۷/۲۔

دیکھئے: مصنف ابن ابی شیبہ ۷۱/۱۔ ۲۷۰۔ مصنف عبدالرزاق ۳۹/۳۔ ۱۳۷۔

کتابُ الام ۱۱۵/۱۔

اعضاء ملا کر رکھیں، پیٹ کو رانوں سے چپکا لیں اور اس طرح سجدہ کریں کہ ان کے لئے زیادہ سے زیادہ ستر ہو، اسی طرح ان کے لئے بہتر ہے کہ رکوع میں بھی اور جلسہ میں بھی بلکہ تمام ہی وہ اس طرح پڑھیں کہ جس سے ان کے لئے زیاددہ سے زیادہ پردہ ہو جائے۔

نیز محدث بیہقی نے عورتوں کے لئے رکوع وسجدہ کی ہیئت پر خصوصی باب قائم کرنے سے پہلے جو تمہید باندھی ہے وہ یوں ہے:

"وجماع ما یفارق المرأة فیه الرجل من احکام الصلوٰة راجع الی الستر وھو انها مامورة بکل ما کان استر لها.

ترجمہ: نماز کے جن احکام میں مرد وعورت کے درمیان فرق ہے وہ اصولی طور ہر ستر کے اصول پر مبنی ہے، عورت اس طریقہ پر مامور ہے جس میں اس کے لئے زیادہ ستر ہو۔

غرض احادیث، آثارِ صحابہ اور تابعین کے فتاویٰ سے واضح ہے کہ مرد وعورت کے نماز کی کیفیت میں بعض امور میں فرق کیا جائے گا۔ یہ رائے شریعت کے اس مزاج سے بھی موافقت رکھتی ہے کہ خواتین کے لئے زیادہ سے زیادہ ستر کا لحاظ رکھا جانا چاہئے اور یہی سلفِ صالحین، ائمۂ متبوعین، محدثین اور فقہائے مجتہدین کی رائے ہے۔

[ ]

سنن بیہقی ۲۲۲/۲۔

مساجد میں عورتوں کی نماز

ایک صاحب نے مساجد میں خواتین کے نماز ادا کرنے کے مسئلہ پر استفتاء کیا تھا، راقم الحروف نے اس کا جواب لکھا تھا، ذیل میں وہ سوال اور جواب درج کیا جاتا ہے تاکہ اس مسئلہ میں صحیح نقطۂ نظر کو سمجھا جاسکے............ وَباللّٰہِ التوفیق.

خلاصۂ سوال:

مساجد میں خواتین کیلئے نماز کا خصوصی انتظام کرنے کی بابت ایک صاحب کی درج ذیل تحریر ہے، پس اس مسئلہ میں حکم شرعی کی وضاحت فرمائی جائے:

’’صحاح ستہ کی مختلف روایات میں یہ بات موجود ہے کہ عورتوں کو مسجد میں آنے سے منع نہ کرو، بعض روایات میں خواتین کو عیدگاہ میں بھی لانے کا حکم دیا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ خواتین کا مساجد اور عیدگاہ میں نماز ادا کرنا سنت ہے، رہ گیا فتنہ، تو فتنہ اور فساد کا احتمال نمازی عورتوں اور مردوں ہی سے؟ یہ بیمار ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے، آج کل معاشرہ میں کم وبیش ہر گھر سے عورتوں اور لڑکیوں کو نکلنا پڑتا ہے، تعلیم کی غرض سے ہو یا علاج ومعالجہ کے لئے، اس لئے صرف مسجد جانے ہی سے ان کو باز رکھنا اور فتنہ وفساد کا بہانہ بنانا درست نہیں، حضرت عائشہ R نے تو جنگِ جمل میں

بھی شرکت کی تھی، جب صحاحِ ستہ کی حدیثوں میں یہ بات موجود ہے کہ عورتوں کو مسجد جانے سے نہ روکو، تو اس کے مقابلہ میں کوئی ضعیف حدیث یا فقہی مسئلہ کی اہمیت نہیں۔ اس لئے مسجد کے منتظمین کو چاہئے کہ مساجد میں خواتین کے لئے نماز کا انتظام کریں‘‘۔

الجواب وَباللّٰہ التوفیق:

مسئلہ یہ نہیں ہے کہ مساجد میں عورتوں کا آنا جائز ہے یا ناجائز؟ بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ ان کا مساجد میں آنا بہتر ہے یا نہیں؟ ان کے مساجد میں آنے کی حوصلہ افزائی کی جائے اور اس کی ترغیب دی جائے یا ان کو گھر میں نماز ادا کرنے کی تلقین کی جائے اور کہا جائے کہ آپ کے لئے اس میں زیادہ فضیلت ہے، عورتوں کے لئے مستقل مسجد یا مسجد کا ایک حصہ تعمیر کرنا ان کو مساجد میں آکر عبادت کرنے کی ترغیب دینا ہے، پس اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ حضور s نے خواتین کے لئے مساجد میں نماز کو پسند کیا ہے یا گھر میں؟ اگر مساجد میں پسند کیا ہو تو ضرور مسجد تعمیر کریں اور ان کو اس کی دعوت دیں، اور اگر ان کے لئے مساجد کے بجائے گھروں میں نماز کی ادائیگی بہتر ہے تو ایسی تدابیر نہ کی جائیں جن سے خواتین کے مساجد میں آکر نماز ادا کرنے کی حوصلہ افزائی ہو۔ اگر اس سلسلہ میں فقہاء کی آراء کے علاوہ خود احادیث پر بھی نگاہ ڈالی جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ خواتین کا مسجدوں میں آنا بہتر نہیں، ان کا گھر میں نماز ادا کرنا بہتر ہے۔ چنانچہ حضرت ام سلمہ r سے مروی ہے:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم صلوٰة المرأة في بيتها خير من صلوٰتها في حجرتها وصلوٰتها في حجرتها خير من صلوٰتها في دارها وصلوٰتها في

دارها خير من صلوتها في مسجد قومها.

ترجمہ: رسول اللہ s نے ارشاد فرمایا کہ عورت کا گھر کے ایک چھوٹے کمرہ میں نماز ادا کرنا ہال میں نماز ادا کرنے سے اور ہال میں نماز ادا کرنا مکان کے احاطہ میں نماز ادا کرنے سے اور اپنے مکان کے احاطہ میں نماز ادا کرنا اپنی قوم کی مسجد میں نماز ادا کرنے سے بہتر ہے۔

حضرت ام حمید ساعدیہ r سے مروی ہے کہ انہوں نے حضور s سے آپ کے ساتھ نماز پڑھنے کی خواہش ظاہر کی، ظاہر ہے کہ یہ نماز مسجد میں اور مسجدِ نبوی s جیسی عالی مرتبت مسجد میں ہوتی اور وہ بھی آپ s کی اقتداء میں لیکن اس کے باوجود آپ s نے ان کو تلقین فرمائی کہ وہ اپنے گھر میں نماز پڑھیں، یہ زیادہ بہتر ہے، طبرانی اور مسند احمد میں یہ روایت اس طرح نقل کی گئی ہے:

عن ام حميد الساعدية انها جاء ت الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقالت يا رسول الله انى احب الصلوة معک قال قد علمت وصلوتک فی بيتک خيرلکِ من صلوتکِ فی حجرتک وَصلوتک فی حجرتک خير من صلوتکِ فی دارک وَصلوتکِ فی دارک خير من صلوتک فی مسجد قومک وصلوتکِ فی مسجد قومک خير من صلوتک فی مسجد الجماعَة.

حافظ ابن حجر جیسے بلند پایہ محدث اور ناقدِ حدیث نے اس حدیث کو ''حدیث حسن''، یعنی مقبول ومعتبر قرار دیا ہے۔

بیهقی ۱۳۱/۳، اعلاء السنن بحواله طبرانی ۲۶۰/٤ اور اس کی سند جید هے۔

فتح الباری ۳۵۰/۲۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود r سے روایت ہے کہ آپ s کا ارشاد ہے:

ما صلت امرأة احب الى الله من صلوتها فى اشد بيتها ظلمة.

ترجمہ: کسی عورت کی عند اللہ اس سے محبوب کوئی نماز نہیں کہ وہ اپنے نہایت تاریک کمرہ میں نماز ادا کرے۔

1 ان صحیح اور مستند معبر اور واضح وصریح ارشاداتِ نبوی s سے ثابت ہے کہ خواتین کا گھر میں نماز پڑھنا بہتر اور افضل ہے، اور جب ان کے حق میں یہ عمل بہتر ہے تو ظاہر ہے کہ یہی عمل ان کے لئے زیادہ اجر وثواب کا باعث بھی ہے، پس حدیث وسنت سے محبت اور سچے تعلق کا تقاضا یہ ہے کہ جیسے آپ s نے عورتوں کے لئے گھر میں نماز پڑھنے کی ترغیب دی اور خواتین کے مساجد میں آنے کی حوصلہ افزائی نہیں فرمائی، اسی طرح خواتین کو یہ ترغیب دی جائے کہ منشاءِ نبوی s کے مطابق مسجدوں میں آنے کے بجائے وہ گھروں میں نماز ادا کریں کہ ان کے لئے آپ s نے اسی طریقہ کو زیادہ پسند فرمایا ہے نہ یہ کہ ان کو مساجد میں آکر نماز ادا کرنے کی ترغیب دی جائے اور اس کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

2 یہ صرف حنفیہ ہی کی رائے نہیں ہے کہ عورتوں کا مسجدوں میں آنے سے اجتناب بہتر ہے بلکہ اس پر قریب قریب تمام ہی فقہاء کا اتفاق ہے، چنانچہ مشہور شافعی محدث اور فقیہ امام نووی نے اپنے گرانقدر تالیف ''شرحِ مہذب'' (۱۹۸/۴) اور فقہاءِ حنابلہ میں ابن قدامہ مقدسی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''المغنی'' (۱۸/۲) میں بھی یہی بات لکھی ہے، اس لئے اس کو کسی ایک گروہ کی رائے نہ سمجھنا چاہئے، بلکہ جمہور فقہاء وشارحینِ حدیث کا یہی نقطۂ نظر ہے۔

بیهقی ۱۳۱/۳۔

3 جن احادیث کا عورتوں کے مساجد میں آنے کی بابت تذکرہ کیا گیا ہے، اس سے اسی قدر معلوم ہوتا ہے کہ خواتین کا احتیاط اور حدود شرعیہ کی رعایت کے ساتھ مسجدوں میں جانا جائز ہے، اس لئے اس کو جائز تو تمام ہی علماء کہتے ہیں، لیکن سلفِ صالحین بدلے ہوئے حالات کے پیشِ نظر اس کو مکروہ اور شرعاً ناپسندیدہ ہونے کے قائل تھے، کوئی بھی صاحبِ عقل اور قرآن وحدیث کا رمز شناس حالات اور ماحول کے تفاوت سے صرف نظر نہیں کرسکتا، آپ s کے زمانہ میں خیر کا غلبہ تھا، لوگ نگاہوں کی حفاظت کرتے تھے، خواتین بھی حد درجہ پردہ کا اہتمام کرتی تھیں، ان کے لباس سادہ ہوتے تھے، نیز خوشبو کے استعمال سے احتیاط کرتی تھیں، صحبتِ نبوی s اور قانونِ شرعی کے نفاذ کا اثر تھا کہ پورے عہدِ نبوت میں زنا کے صرف پانچ، چھ مقدمات عدالت کے سامنے آئے، نماز کے وقت صورتحال یہ ہوتی تھی کہ تمام ہی لوگ مسجد میں حاضر ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ منافقین بھی مسجدوں میں حاضری سے چارہ نہیں پاتے تھے۔ اس لئے اس کا خطرہ نہ ہوتا تھا کہ راستہ میں اوباش لوگ ہوں گے اور راہ گیروں سے چھیڑ چھاڑ کریں گے۔

سلسلہ وحی جاری تھا، خواتین کے لئے تعلیم وتعلّم کا اس طرح کا کوئی نظم نہیں تھا جس طرح کا نظم مردوں کے لئے صفہ میں تھا، اس لئے آپ s کے خطبات اور طریقۂ عبادت سے براہِ راست آگہی اس کے بغیر ممکن نہ تھی کہ وہ مساجد اور عبادت گاہوں میں آیا کریں اور عبادت اور موعظت کے مواقع میں آپ کے عمل کو براہِ راست دیکھ سکیں اور آپ s کی باتوں کو خود سن سکیں اور بعد میں اس کو روایت کرسکیں۔ اس لئے آپ s نے ہدایت فرمائی، اگر خواتین مسجد آنے پر اصرار کریں تو روکا نہیں جائے اور اس میں شدت نہ برتی جائے۔

4 پھر آپ s نے خواتین کے مسجد میں آنے کے کچھ آداب بھی مقرر فرمائے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ عورتیں دیدہ زیب کپڑے پہن کر اور خوشبو کا

First Proof	15-06-09
Second Proof	00-00-00
FINAL	00-00-00
TOTAL-PAGE	242-1st-proof

استعمال کر کے نہ آئیں، چنانچہ مشہور محدث حافظ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب ''التمہید'' میں حضرت عائشہ R سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ s نے ارشاد فرمایا:

ایها الناس انهوا نساء کم من لبس الزینة والتبختر فی المساجد فان بنی اسرائیل لم یمنعوا لبس نساء هم الزینة وتبخترها فی المساجد. 🗁

ترجمہ: لوگو! اپنی خواتین کو مسجدوں میں خوشبو کے استعمال اور آرائشی لباس سے منع کرو، کیونکہ بنی اسرائیل اسی وقت ملعون ٹھہرائے گئے جب ان کی عورتوں نے آرائشی لباس اور خوشبو کا استعمال مسجدوں میں شروع کردیا۔

اس حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ بنی اسرائیل کی خواتین کو بھی ابتداء مساجد میں آنے کی اجازت تھی لیکن جب ان میں جذبہ آرائش کا غلبہ ہوا تو ان کو مساجد میں آنے سے روک دیا گیا۔ معلوم ہوا کہ اگر یہی علت اس امت میں پائی جائے تو اس امت میں بھی خواتین کے مساجد میں آنے کی حوصلہ شکنی کرنی چاہئے۔ جن حضرات نے عورتوں کو اس سے منع کیا ہے انہوں نے خدانخواستہ حدیث کی مخالفت نہیں کی ہے بلکہ شریعت کے مقصد ومنشاء کو سمجھ کر اس کے تقاضا پر عمل کیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ منشاء شریعت کو سمجھنے کے لئے کتاب وسنت پر نگاہ کے ساتھ ساتھ عقل وبصیرت اور مؤمنانہ فراست بھی مطلوب ہے اور یہ کم لوگوں کو میّسر آتی ہے۔

بخاری کی روایت سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ آپ s نے خواتین کو صرف رات کے وقت مسجدوں میں آنے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی 🗎 رات سے مراد وہ نمازیں ہیں جو تاریکی میں پڑھی جاتی ہیں یعنی مغرب، عشاء اور فجر، کیوں کہ ان اوقات میں تاریکی کی وجہ سے بے پردگی سے حفاظت کا ایک قدرتی انتظام موجود ہوتا

🗁 فتح القدیر ۳۶۵/۱۔

🗎 بخاری عن ابن عمر ۱۲۳/۱۔

ہے اور اہلِ علم نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان اوقات میں اہل فسق کی چلت پھرت کم ہو جاتی تھی، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آج کل رات کے وقت فتنے جاگتے ہیں اور فسق و فجور میں مبتلا لوگ اپنا دام پھیلاتے ہیں۔

اب غور کیا جائے کہ کیا موجودہ ماحول میں یہ بات ممکن ہے کہ خواتین کو دیدہ زیب لباس اور خوشبو کے استعمال سے روکا جاسکے، اور ان کے لئے اس طرح کی پابندی لگائی جاسکے کہ وہ ایسے اوقات میں مسجدوں میں آنے سے گریز کریں جن اوقات میں فتنہ کا اندیشہ ہو؟ پھر کیا یہ بھی ممکن ہے کہ جو لوگ فسق و فجور کا مزاج رکھتے ہوں، قانون کی طاقت استعمال کرکے ان کو مسجدوں کے قریب آنے جانے سے باز رکھا جاسکے اور کیا یہ بات بھی ممکن ہوگی کہ جیسے آپ s نے اپنے زمانہ میں ان اسباب کو ختم فرمایا جو انسان کے اندر برے خیالات پیدا کرتے ہیں، پردہ کا حکم سختی کے ساتھ دیا گیا، مردوں اور عورتوں کے اختلاط سے منع فرمایا گیا، شراب پر مکمل پابندی عائد کی گئی، زنا کو نہ صرف حرام کیا گیا بلکہ وہ تمام راستے بھی بند کردیئے گئے جو انسان کو ایسی برائیوں کی طرف لے جاتے ہیں، کیا آج کسی مسجد کی کمیٹی کے لئے ایسی احتیاطی تدبیروں کا اہتمام ممکن بھی ہے؟ اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ مسجد آنے والی خواتین شرعی حدود میں رہتے ہوئے گھر سے مسجد تک کا فاصلہ طے کریں گی اور اپنے خیالات اور جذبات کو بھی پاکیزہ رکھیں گی تو کیا یہ حسنِ ظن ان راستہ چلتے اور آتے جاتے اچھے برے مردوں سے بھی رکھا جاسکتا ہے؟

5 انہی امور کو سامنے رکھتے ہوئے سلف صالحین اور سنتِ نبوی s سے سب سے زیادہ محبت رکھنے والے اور حضور s کے فرمودات و معمولات سے آگاہ صحابۂ کرام نے اپنے عہد میں خواتین کی مسجدوں میں آمد و رفت کو ناپسند فرمایا، ام المؤمنین حضرت عائشہ R سے بڑھ کر کون ہوگا جو آپ s کی پسند اور ناپسند سے واقف ہو اور خاص کر عورتوں کے افعال کے بارے میں

لیکن وہ فرماتی ہیں کہ:

لو ادرک رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ما احدث النساء لمنعھن المسجد کما منعت نساء بنی اسرائیل فقلت لعمرۃ او منعن قالت نعم.

ترجمہ: آج خواتین کا جو رویہ ہے اگر رسول اللہ s نے اس کو دیکھا ہوتا تو ان کو مسجد سے روک دیا ہوتا جیسے بنی اسرائیل کی خواتین کو روک دیا گیا، راوی کا بیان ہے کہ میں نے عمرہ سے دریافت کیا کہ کیا وہ روک دی گئی تھیں؟ انہوں نے کہا: ہاں۔

یہ حدیث رسول اللہ s کے مقابلہ فتویٰ نہیں ہے، یہ بات کیسے سوچی جاسکتی ہے کہ مستفتی کو تو حدیثِ رسول سے اتنی محبت ہو کہ وہ حدیث کے مقابلہ فتویٰ قبول نہ کریں اور حضرت عائشہ R یہ جانتے ہوئے کہ حضور s نے عورتوں کو روکنے سے منع فرمایا، اس کے خلاف فتویٰ دے دیں، گویا ان کے دل میں سنتِ رسول s کی اتنی محبت بھی نہیں جتنی مستفتی صاحب کے دل میں ہے، اس طرح کی بات دراصل حضراتِ صحابہ کے ساتھ گستاخی اور جسارت کا درجہ رکھتی ہے، اس سے توبہ کرنی چاہئے حقیقت یہ ہے کہ حضرت عائشہ نے اپنے اس فتویٰ کے ذریعہ آپ s کے مقصد و منشا کی تکمیل فرمائی ہے نہ کہ مخالفت۔

غور فرمایئے کہ حضرت عبداللہ ابن عمر r اپنے صاحبزادہ پر اس لئے خفا ہوگئے کہ وہ ان کو مسجد میں جانے دینے پر آمادہ نہیں تھے، لیکن انہی حضرت عبداللہ ابن عمر q کا معمول بہ سندِ صحیح یہ نقل کیا گیا ہے کہ آپ خواتین کو عیدین میں نہیں بھیجتے تھے، **انہ کان لا یخرج نساء ہ فی العیدین.** اور حضرت عروہ بن زبیر r کے بارے میں مروی ہے کہ **انہ کان لایدع امرأۃ من اھلہ**

مسلم ۱۸۳/۱، ابوداؤد ۸۴/۱، ترمذی ۱۲۰/۱۔

مصنف ابن ابی شیبہ ۱۸۳/۲۔

تخرج الی فطر ولا الی اضحیٰ 🗀 وہ اپنی خاندان کی عورتوں کو عیدالفطر اور عید الاضحیٰ میں (عیدگاہ) جانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جن صحابہ کو عورتوں کو مساجد میں جانے کی ممانعت پر ابتداء اطمینان نہیں تھا، بعد کے حالات کو دیکھ کر وہ بھی اس کے قائل ہو گئے تھے کہ عورتوں کو مسجد میں نہیں آنا چاہئے۔ جیسے حضرت عبداللہ ابن عمر r، بالخصوص ان حالات میں کہ عہدِ نبوت میں خواتین کے مساجد میں آنے کے لئے جو مصلحت تھی وہ اب باقی نہ رہی اوران کے مسجد میں آنے کیلئے جو شرائط اور حدود و قیود تھیں ان کو باقی رکھنا اب دشوار ہے۔

6 یہ تو بچکانہ ہی بات کہی جاسکتی ہے کہ صرف نمازی عورتوں اور مردوں سے فتنہ و فساد صادر ہونا ایک عظیم بہتان ہے، ایک تو جن حضرات نے خواتین کو مساجد میں آنے سے منع کیا ہے انہوں نے یہ نہیں کہا کہ صرف نمازی خواتین سے فتنہ کا اندیشہ ہے کیونکہ یہ بات ممکن بلکہ بہت ممکن ہے کہ بعض بدطینت عورتیں جو نماز کی پابند نہ ہوں نماز کا بہانہ کر کے غلط راستہ اختیار کریں، پھر یہ سوچنا بھی درست نہ ہوگا کہ جو نمازی ہو اس سے فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، آپ s نے فرمایا کہ شیطان انسان کے وجود میں خون کی طرح دوڑتا ہے، اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا تو حضور s نے عورتوں کی صف پیچھے نہ رکھی ہوتی، یہ اصول نہ رکھا ہوتا کہ جب تک مرد سجدہ سے سر نہ اٹھالیں عورتیں سر اٹھانے سے گریز کریں یہ معمول مقرر نہ ہوتا کہ خواتین پہلے چلی جائیں اور مرد بعد میں مسجد سے جائیں خوشبو اور دیدہ زیب لباس کی ممانعت نہ ہوتی، یہ تمام حدود و قیود صحیح و معتبر حدیثوں سے ثابت ہیں، ظاہر ہے یہ سب کچھ ''نمازی خواتین'' سے فتنہ کے سدّ باب ہی کے لئے تو آپ s نے فرمایا اور وہ بھی عہدِ نبوی s میں جو حدیث کے مطابق ''خیر القرون'' ہے، یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ بہتان ایک الگ چیز ہے اور احتیاط ایک دوسری چیز۔

7 یہ صحیح ہے کہ خواتین دوسری ضروریات کے لئے گھر سے باہر نکلتی ہیں، ظاہر

🗀 حوالۂ سابق۔

ہے کہ شریعت کا حکم وہاں بھی یہی ہے کہ اگر کسی طبعی یا شرعی ضرورت کے بغیر وہ گھر سے نکلیں تو یہ ناپسندیدہ ہے اور فتنہ کا اندیشہ ہو تو ناجائز، لیکن وہاں اس کی طرف سے ایک ناشائستہ بات ظاہر ہوتی ہے یا خود وہ کسی ناشائستہ بات کا شکار ہوتی ہے تو ظاہر ہے یہ برائی دنیا کی طرف منسوب ہوتی ہے، اس سے بازار بدنام ہوتا ہے لیکن وہی برائی بلکہ اس سے کم تر درجہ کی بھی برائی کسی دینی مرکز پر پیش آئے، مسجد میں پیش آئے تو اب یہ برائی دین کی طرف منسوب ہوگی، دین اور دینی مراکز بدنام ہوں گے اور دین کے اعتبار و وقار کو نقصان پہنچے گا۔

یہ بات مشاہدہ میں آتی ہے کہ دوسری قوموں کی مذہبی عبادت گاہوں جہاں مردوں اور عورتوں کا اختلاط ہوتا ہے، یا بدعات کے مراکز درگاہوں وغیرہ میں جہاں عرس کا مخلوط اجتماع ہوتا ہے وہاں باوجود یکہ اپنے اپنے خیال کے مطابق (گو ان کے عقائد باطل ہیں) تقدس واحترام ہی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود بہت سے ناخوشگوار اور ناگفتنی واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔

8 حضرت عائشہ R کے جنگِ جمل کے واقعہ سے وہی شخص استدلال کرسکتا ہے جو تاریخ سے نابلد ہو، حضرت عائشہ R کے اس عمل کو اکابر صحابہ میں سے کسی نے بھی پسند نہیں کیا، حضرت ام سلمہ R نے ان کو تفصیلی مکتوب لکھا اور ان کے اس عمل سے اختلاف فرمایا اور بعد کو خود حضرت عائشہ R کو اپنے اس عمل پر پچھتاوا اور افسوس تھا، حیرت ہے کہ جس واقعہ پر حضرت عائشہ R کو پچھتاوا تھا، اس سے مساجد میں خواتین کے نماز ادا کرنے پر استدلال کیا جائے اور حضرت عائشہ R کا جو فتویٰ مساجد میں عورتوں کی آمد و رفت کی ممانعت سے متعلق تھا، اور جس پر وہ قائم و دائم رہیں، اس کو قابل اعتناء تصور نہ کیا جائے۔

9 استفتاء میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ ''صحیح احادیث جو صحاحِ ستہ میں موجود

ہیں اور جو سند کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے مقابلہ میں کوئی ضعیف حدیث یا فقہی مسائل کو کوئی اہمیت نہیں ہے''۔ اس طرح کی بات ناسمجھ اور ناواقف ہی لوگ کہہ سکتے ہیں، نہ یہ سمجھنا درست ہے کہ تمام صحیح حدیثیں صحاحِ ستہ ہی میں محفوظ ہوگئی ہیں، دوسری کتب میں غیر معتبر روایات ہیں اور نہ یہ درست ہے کہ صحاحِ ستہ کی تمام روایتیں معتبر ہیں اور ان میں ضعیف روایات نہیں، حقیقت یہ ہے کہ صحاحِ ستہ کے مصنفین تو بعد کے ہیں، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد، امام ابویوسف، امام محمد، امام عبدالرزاق ابن ہمام، امام ابن ابی شیبہ، امام اسحاق بن راہویہ M، یہ وہ ائمہ حدیث ہیں کہ بہت سی صحیح، معتبر ترین احادیث ہیں کہ ان حضرات کی کتابوں میں موجود ہیں، صحاحِ ستہ میں نہیں ہیں، امام بخاری I نے خود لکھا ہے کہ مجھے ایک لاکھ صحیح احادیث یاد تھیں، میں نے ان سے صحیح بخاری کا انتخاب کیا ہے اور صحیح بخاری کی کل روایات سات ہزار سے کچھ اوپر اور مکررات حذف کرنے کے بعد دو ہزار سے کچھ اوپر ہیں، یہ روایتیں ان ائمہ مجتہدین کی کتابوں میں مل سکتی ہیں تو آخر اس سے بڑھ کر سنت سے عداوت کیا ہوگی کہ کوئی شخص حدیثِ نبوی s سے بہ حیثیتِ حدیث محبت کرنے کے بجائے اس لئے محبت کرے کہ یہ فلاں کتاب میں آئی ہے نہ کہ فلاں کتاب میں؟ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ہدایت عطا فرمائے۔

جتنی غلط بات یہ ہے کہ صحیح و مستند حدیث صرف صحاحِ ستہ میں ہے اس سے کم غلط اور خلاف واقعہ یہ بھی نہیں کہ صحاحِ ستہ کی تمام روایات معتبر ہیں، صحاحِ ستہ کی بہت سی روایات پر کلام کیا گیا ہے اور آج کل بعض غیر مقلد حضرات نے تو امام بخاری کو بھی نہیں بخشا ہے جن کی احادیث کی وہ دہائی دیتے ہیں۔

فقہی مسائل سے یہ بے نیازی بھی ایک لطیفہ سے کم نہیں، گویا اب ہر عام و خاص کو خود اجتہاد کرنا ہے، چاہے عربی زبان سے بھی واقف نہ ہو براہِ راست قرآن وحدیث سے مسائل مستنبط کرنا ہے، دنیا میں انسان کے خودساختہ قوانین پر

بھی گفتگو کے لئے کچھ علم اور مقام مطلوب ہے لیکن قرآن وحدیث اتنا مظلوم ہے کہ اس پر کلام کے لئے نہ علم کی ضرورت ہے اور نہ فہم کی، فقہی مسائل کیا ہیں؟ قرآن وحدیث میں جو اصول بتائے گئے ہیں اور جو احکام وقوانین مختلف مقامات پر مذکور ہیں، انہیں کی مرتب ومدون صورت! ان مسائل سے وہی شخص بے نیاز ہوسکتا ہے جو کتاب وسنت کے بجائے اپنی خواہشات کی شریعت پر عمل کرنا چاہتا ہو، پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ کسی حدیث کا صحیح وضعیف اور معتبر ونامعتبر ہونا آپ کو کس طرح معلوم ہوا؟ اسی طرح نہ کہ فلاں محدث نے اس حدیث کو صحیح یا ضعیف کہا ہے؟ تو حدیث کی صحت وضعف کے بارے میں آخر محدثین کے فتویٰ پر عمل کرتے ہیں تو فقہاء کے فتاویٰ زیادہ قابلِ عمل ہیں، کیوں کہ وہ حدیث کے الفاظ سے بھی واقف تھے اور اس کے معانی ومقاصد سے بھی۔

پس خلاصہ یہ ہے کہ ایک ایسے سماج میں جہاں قانون شریعت نافذ نہیں، شرعی حدود و قیود کا لحاظ رکھنا ممکن نہیں، برائی کے محرکات عام ہیں بدنگاہی، بے پردگی، عریاں فلمی اشتہارات، ٹی وی اور ویڈیو کے ذریعہ ہر لمحہ گویا برائی کی دعوت دی جاتی ہے، وہاں خواتین کی مسجدوں میں آمد ورفت فتنوں کے دروازوں کو کھولے گی، دین کے نام پر بے دینی کا ارتکاب ہوگا، اس سے سنت کا احیاء نہیں بلکہ شریعت کے مقصد و منشا کی خلاف ورزی اور آپ s کی تعلیمات کی مخالفت ہوگی، آپ s نے خواتین کے لئے اسی کو بہتر سمجھا ہے کہ وہ گھر ہی میں نماز ادا کیا کریں۔

اس لئے مساجد کے منتظمین کا خواتین کے لئے مسجدوں میں نماز کا مستقل نظم کرنا، اس کی ترغیب دینا اور حوصلہ افزائی کرنا نہایت نامناسب اور نادرست عمل ہوگا۔

وَبِاللّٰہِ التوفیق وَھُو المستَعانَ.

ایک مجلس کی تین طلاقیں

ایک ہی دفعہ یا ایک ہی مجلس کی تینوں طلاقیں واقع ہوجائیں گی یا ایک ہی شمار ہوگی؟ اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور جمہور علماء ومحدثین اہلِ سنت والجماعت M کا خیال ہے کہ تینوں طلاقیں واقع ہوجائیں گی۔ چنانچہ امام نووی کا بیان ہے:

قال الشافعی ومالک وابوحنیفة واحمد وجماهیر العلماء من السلف والخلف یقع الثلاث.[1]

ترجمہ: امام شافعی، امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام احمد اور جمہور علماء سلف وخلف M کے نزدیک تین طلاق واقع ہوجائیں گی۔

اہل سنت والجماعت کا اس مسئلہ پر اس درجہ اتفاق رہا ہے کہ ایک محدث ابن تین کو خیال ہوگیا کہ تینوں طلاقوں کے واقع ہونے میں کوئی اختلاف ہی نہیں[2] اصل میں ایک مجلس میں تین طلاقوں کا ایک شمار کیا جانا شیعہ حضرات کا مذہب ہے، اہلِ سنت میں محض کچھ اصحاب ظواہر اس کے قائل تھے[3] اسی رائے کو ہمارے زمانہ میں غیر مقلد حضرات نے اختیار کیا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن، صریح احادیث اور حضرات صحابۂ کرام p کے متفقہ فتاویٰ سے یہ بات ثابت ہے کہ ایک مجلس میں تین

[1] شرح نووی علی مسلم ۱/۴۷۸۔
[2] فتح الباری ۹/۲۷۶۔
[3] فتح الباری ۹/۲۷۵۔

طلاقیں بھی واقع ہوجاتی ہیں اور یہی حق ہے۔

اہلِ سنت والجماعت جو قریب قریب اس بات پر متفق ہیں کہ (ایک مجلس کی تین طلاقیں بھی واقع ہوجاتی ہیں) کے دلائل اس طرح ہیں:

قرآن مجید میں فرمایا گیا:

1 الطلاق مرتان فامساک بمعروفٍ اوتسریح باحسان .... فان طلقها فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجًا غیره. (بقرہ: ۲۲۹، ۲۳۰)

ترجمہ: طلاق دو بار ہے پھر بھلے طریقہ پر روک لینا ہے یا بھلے طریقہ پر چھوڑ دینا، پھر اگر طلاق دے ہی دے تو وہ عورت اس وقت تک طلاق دینے والے مرد کے لئے حلال نہیں جب تک مطلقہ کسی اور مرد کے نکاح میں نہ جائے۔

اس آیت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ طلاق کی تعداد کا تعلق مجلس سے نہیں ہے بلکہ اس بات سے ہے کہ کتنی بار طلاق دی جاتی ہے۔ اگر دو بار طلاق دے تو دو طلاق واقع ہوگی، تین بار دے تو تین طلاق واقع ہوگی، خود قرآن مجید میں دوسرے مواقع پر بھی "مرۃ" (بار) کا لفظ اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے گھر میں آمد کے لئے اجازت اور استیذان کے طریقے پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

2 لیستأذنکم الذین ملکت ایمانکم والذین لم یبلغوا الحلم منکم ثلاث مرات. (سورہ نور: ۵۸)

ترجمہ: تمہارے غلام اور تم میں سے نابالغوں کو تین بار (گھر میں داخل ہونے کیلئے) اجازت طلب کرنی چاہئے۔

اگر کسی بات کے تین دفعہ واقع ہونے کے لئے تین مجلسوں میں اس کا وقوع ضروری ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ گھر میں داخل ہونے کے لئے یہ تین الگ

الگ مجلسوں میں اجازت لینا ضروری ہو اور ظاہر ہے کہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں، کوئی بے وقوف ہی ہوگا جو ایسی بات کہے۔ اس لئے خود امام بخاری I نے بھی اس آیت سے تین طلاقوں کے واقع ہو جانے پر استدلال کیا ہے اور اس طرح باب قائم کیا ہے:

3 باب من اجاز الطلاق الثلاث لقول اللّٰہ تعالیٰ" الطلاق مرتان فامساک بمعروف او تسریح باحسان".

ترجمہ: ان لوگوں کا بیان جنہوں نے ارشادِ خداوندی "طلاق دو مرتبہ ہے پھر بھلے طریقہ پر روکنا ہے یا چھوڑ دینا" کی وجہ سے تین طلاق کو واقع قرار دیا ہے۔

احادیث میں بھی ایک کام کے تین دفعہ کرنے کا حکم مختلف جگہ وارد ہوا ہے جیسے رکوع وسجدہ میں تین دفعہ تسبیحات کا پڑھنا، نمازوں کے بعد ۱۰ یا ۲۵ یا ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، الحمدللہ اور اللہ اکبر کا پڑھنا۔ مردہ کو تین یا پانچ یا سات بار غسل دینا، کفن کو تین بار دھونی دینا۔ ہر جگہ یہی "مرّات" کا لفظ ہے جو آیتِ طلاق میں اوپر استعمال ہوا ہے اور ان میں سے کہیں بھی الگ الگ مجلسوں میں ان کو کہنا اور کرنا مراد نہیں۔ تو ضرور ہے کہ اس آیت میں دو یا تین مرتبہ طلاق دینے کا مطلب الگ الگ مجلسوں میں طلاق دینا نہیں بلکہ مطلقاً تین دفعہ طلاق دینا ہے خواہ ایک مجلس میں دی جائے یا الگ الگ مجلس میں اور یہ تینوں ہی طلاقیں معتبر اور مؤثر ہوگی۔

احادیث:

احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ تین طلاقیں مطلقاً واقع ہو جاتی ہیں۔ خواہ ایک مجلس میں دی جائیں یا متعدد مجلسوں میں چند روایتیں نقل کی جاتی ہیں:

بخاری ۷۹۱/۲۔

1 عن عائشة ان رجلا طلق امرأته ثلاثًا فتزوجت فطلقت فسئل النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم أتحل للأوّل؟ قَال: حَتی یَذوقَ عُسیلتها کما ذاق الاوَّلُ.

(بخاری ۷۹۱/۲)

ترجمہ: حضرت عائشہ R سے روایت ہے کہ ایک صاحب نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی، اس نے (دوسرے مرد سے) نکاح کیا پھر اس سے بھی طلاق واقع ہوگئی۔ آپ s سے دریافت کیا گیا کہ کیا وہ پہلے شوہر کے لئے حلال ہے؟ آپ s نے فرمایا کہ اسی وقت جبکہ دوسرا شوہر پہلے شوہر کی طرح اس کا ذائقہ اٹھالے۔

2 عن ابی سلمة بن عبدالرحمٰن ان فاطمة بنت قیس اخبرته ان زوجها ابا حفص ابن المغیرة المخزومی طلقها ثلاثا ثم انطلق الی الیمن فانطلق خالد بن ولید فی نفرٍ فأتوا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم فی بیت میمونة ام المؤمنین فقالوا: ان ابا حفص طلق امرأته ثلاثًا فهل لها نفقة؟ فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم لیس لها نفقة وعلیها العدة.

ترجمہ: ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن I سے مروی ہے کہ حضرت فاطمہ بنت قیس r نے ان سے بتایا کہ ان کے شوہر ابوحفص بن مغیرہ مخزومی نے ان کو تین طلاق دے دی اور یمن چلے گئے۔ حضرت خالد بن ولید ایک جماعت کے ساتھ ام المؤمنین حضرت میمونہ R کے مکان

مسلم ۴۸۴/۱۔

میں آپ s کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ابوحفص نے اپنی بیوی کو تین طلاق دی ہے تو کیا وہ نفقہ کی حقدار ہیں؟ آپ s نے فرمایا: ان کے لئے نفقہ نہیں ہے، البتہ ان پر عدت ہے۔

مسلم کی بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ فاطمہ بنت قیس حضور s کی خدمت میں آئیں تو حضور s نے دریافت فرمایا کہ ابوحفص نے تم کو کتنی طلاقیں دی ہیں؟ فاطمہ نے کہا تین "قلت ثلاثًا".

غور فرمایئے کہ حضرت ابوحفص نے تین طلاقیں دی اور آپ نے ان کو واقع قرار دیا۔ یہ تینوں طلاقیں ایک ہی کلمہ میں دی گئی تھیں۔ چنانچہ دارقطنی کی روایت میں ہے:

ان حفص بن المغيرة طلق امرأته فاطمه بنت قيس على عهد رسول اللّٰه ثلاث تطليقات فى كلمة واحدة فابانها منه النبى صلى اللّٰه عليه وسلم ولم يبلغنا ان النبى عاب ذلک عليه.

ترجمہ: حفص بن مغیرہ نے اپنی بیوی فاطمہ بنت قیس کو عہد نبوی میں ایک کلمہ میں تین طلاق دیدی، آپ s نے فاطمہ کو ان سے علاحدہ کر دیا اور ہمیں ایسی اطلاع نہیں پہونچی کہ آپ s نے ان کے اس عمل کی مذمت کی ہو۔

3 آنحضور s کے زمانہ میں حضرت عویمر r اور ان کی اہلیہ کے درمیان لعان کا واقعہ پیش آیا۔ اس واقعہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے احادیث میں یوں آیا ہے۔

فلما فرغا قال عويمر كذبت عليها يارسول اللّٰه ان

مسلم ۱/۴۸۵۔

سنن دارقطنی ٤/ ١٢۔

امسكتها فطلقها ثلاثا قبل ان يأمره رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم.

ترجمہ: جب عویمر r اور ان کی اہلیہ لعان سے فارغ ہوئے تو عویمر نے کہا اگر میں اس کو اب بھی رکھوں تو میں جھوٹا ہوں گا چنانچہ آپ s کو حکم دینے سے پہلے ہی ان کو تین طلاقیں دے دیں۔

4 عن انس قال معاذ بن جبل يقول سمعت رسول اللّٰه يقول: يامعاذ! من طلق البدعة واحدة او اثنين او ثلاثًا الزمناه بدعته.

ترجمہ: حضرت انس r حضرت معاذ r سے راوی ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ s کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ معاذ! جس نے طلاق بدعی دی ایک یا دو یا تین تو ہم اس پر اس کی بدعت کو لازم کر دیں گے (یعنی واقع کر دیں گے)۔

5 عن عبادة بن الصامت قال: طلق جدى امرأة له الف تطليقة فانطلقت الى النبى فسألته فقال: أما اتقى اللّٰه جدک، اما ثلاثة فله واما تسعمائة وسبعة وتسعون فعدوان وظلم انشاء اللّٰه عذبه وان شاء غفر له.

ترجمہ: حضرت عبادہ r سے روایت ہے کہ میرے دادا نے اپنی

بخاری ۲/ ۷۹۱۔ نیز دیکھئے: مسلم ۱/ ۴۸۹۔

دارقطنی ۲/ ٤٤٤۔

مجمع الزوائد ٤/ ٣٣٨ بحواله طبرانی۔ نیز دیکھئے: مصنف عبدالرزاق: ٦/ ٣٩٣ سنن دارقطنی ٢/ ٤٣٣ ط: دهلی۔ المطالب العاليه ٢/ ٣٦۔

بیوی کو ایک ہزار طلاق دے دی، میں حضور s کی خدمت میں حاضر ہوا اور مسئلہ دریافت کیا آپ s نے ارشاد فرمایا: تمہارے دادا کو خدا کا خوف نہیں، تین طلاق تو اس کی ہوئی (یعنی واقع ہوگئی) باقی ۹۹۷ ظلم وسرکشی ہے، اللہ چاہیں تو عذاب دیں چاہیں تو معاف فرمادیں۔

6 حضرت عبداللہ ابن عمر r نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں ایک طلاق دے دی، آپ s نے رجعت کا حکم دیا اور فرمایا کہ تم نے خلاف سنت کام کیا۔ حضرت عبداللہ ابن عمر q نے عرض کیا کہ اگر میں نے اسی وقت تین طلاق دے دی ہوتی تو کیا میرے لئے رجوع کرنے کی گنجائش ہوتی؟ آپ s نے فرمایا نہیں اور یہ تمہارا عمل معصیت اور گناہ ہوتا **"أفرایت لو انی طلقتها ثلاثًا کان یحل لی ان اراجعها قال لا کانت تبین منک وتکون معصیة".** 🗀

7 عائشہ خثمیہ حضرت حسن کی بیوی تھی، حضرت حسن نے ان کو ایک ساتھ تین طلاقیں دے دی، پھر عدت گذرنے کے بعد جب حضرت علی r نے متعہ کے طور پر کچھ تحفہ بھیجا تو خاتون نے کہا کہ جس محبوب کی طرف سے جدائی ہوئی ہے اس کی طرف سے یہ بہت حقیر تحفہ ہے "متاع قلیل من حبیب مفارق" حضرت حسن کو اس کی اطلاع پہنچی تو رونے لگے کہ اگر میں نے اپنے نانا سے نہ سنا ہوتا کہ جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی ہو خواہ حالت حیض میں ہو یا ایک دفعہ میں تو وہ عورت اس وقت تک اس مرد کے لئے حلال نہیں ہوتی جب تک دوسرے مرد کے نکاح میں نہ چلی جائے تو میں اس سے رجوع کرلیتا۔ 🗎

🗀 سنن بیهقی ۷/ ۳۳٤۔

🗎 سنن بیهقی ۷/ ۳۳۵۔

آثار صحابہ r:

علقمہ r راوی ہیں:

1 جاء ابن مسعود رجل فقال انی طلقت تسعا وتسعین وانی سألت فقیل قد بانت منی فقال ابن مسعود قد احبوا ان یفرقوا بینک وبینها قال فما تقول یرحمک اللّٰه فظن انه سیرخص له فقال ثلاث تبینها منک وسائرهن عدوان 🗀

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن مسعود r کے پاس ایک صاحب آئے اور کہا کہ میں نے ۹۹ طلاقیں دی ہیں، میں نے مسئلہ معلوم کیا تو مجھے بتایا گیا کہ میری بیوی مجھ سے جدا ہوگئی، آپ r نے فرمایا: لوگ تمہارے اور اس کے درمیان جدائی کے خواہاں ہیں، اس نے کہا اللہ آپ رحم فرمائے، آپ کی کیا رائے ہے؟ وہ آپ سے سہولت کی امید رکھتا تھا، آپ r نے فرمایا، تین طلاقوں نے تم کو اس سے جدا کردیا باقی ظلم وتعدی ہیں۔

2 حضرت علی r کے بارے میں مروی ہے کہ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاق دی ہے آپ نے فرمایا کہ تین طلاق کی وجہ سے وہ تم پر حرام ہوجائے گی باقی کو اپنی دوسری بیویوں پر تقسیم کردو۔ 🗎

3 حضرت عبداللہ ابن عمر r سے مروی ہے کہ جس نے اپنی بیوی کو

🗀 مجمع الزوائد: ٤/ ۳۳۸ بحوالہ طبرانی وقال الهیثمی رجاله رجال الصحیح۔ نیز دیکھئے: المطالب العالیه: ۲/ ٦۲۔ مصنف عبدالرزاق: ٦/ ۳۹٤ مؤطا امام مالك مع الزرقانی: ٤/ ٦۸۔

🗎 بیهقی: ۷/ ۳۳۷۔ نیز دیکھئے: مصنف عبدالرزاق: ٦/ ۳۹٤۔

تین طلاق دیا اس کی طلاق واقع ہوگئی، البتہ اس نے اپنے رب کی نافرمانیکی، "من طلق امرأته ثلاثًا طلقت وعصى ربه."

4 حضرت عمر کی خدمت میں ایسے شخص کو لایا گیا جس نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاق دی تھی، آپ r نے اس کو درہ رسید کیا اور فرمایا کہ تو نے دین سے کھلواڑ کیا ہے۔ پھر کہا کہ تمہارے لئے تین طلاقیں کافی تھیں، "ان کان لیکفیک ثلاث".

5 حضرت عبداللہ ابن عباس r سے عرض کیا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو ایک سو طلاقیں دی ہیں۔ آپ r نے فرمایا وہ اس سے تین لے لے اور ستانوے چھوڑ دے۔ تھوڑے فرق کے ساتھ اس مضمون کی متعدد روایتیں حضرت عبداللہ بن عباس q سے منقول ہیں جن کو آپ کے ممتاز تلامذہ عطاء سعید بن جبیر اور عکرمہ وغیرہ نے نقل کیا ہے۔

6 عمران بن حصین r کے بارے میں مروی ہے کہ ایک صاحب کے بارے میں سوال کیا گیا جنہوں نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دی تھی۔ فرمایا کہ اس نے گناہ کیا لیکن اس پر اس کی بیوی حرام ہوگئی۔ "فقال رجل طلق امرأته ثلاثًا وهو في مجلس قال اثم بربه وحرمت عليه امرأته".

حقیقت یہ ہے کہ آیت قرآنی، احادیث اور صحابہ کے اقوال وفتاویٰ اس سلسلہ میں اس قدر واضح اور بے غبار ہیں کہ کسی صاحب انصاف اور متلاشی حق کو شبہ نہیں ہوسکتا

مصنف عبدالرزاق ٦/ ٣٩٥۔

بیھقی: ٧/ ٣٣٤۔ نیز دیکھئے: مصنف عبدالرزاق ٦/ ٣٩٣۔

دیکھئے: مصنف عبدالرزاق ٦/ ٩٧۔ ٣٩٦۔ مؤطا امام مالك: ١٩٩۔

المطالب العالية: ٦٣/٢۔ بیھقی ٧/ ٣٣٧۔ ٣٣١۔ سنن بیھقی: ٣٣٢/٧۔

First Proof	15-06-09
Second Proof	00-00-00
FINAL	00-00-00
TOTAL-PAGE	242-1st-proof

کہ ایک مجلس میں تین طلاقیں دینا گو گناہ ہے لیکن واقع ہوجاتی ہے اور یہی عقل وقیاس کا بھی تقاضہ ہے۔

جو حضرات ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک ہی شمار کرتے ہیں ان کے پیش نظر دو روایات ہیں۔ ایک حضرت رکانہ r والی اور دوسرے حضرت طاؤس کی، اور دونوں روایتیں حضرت عبداللہ بن عباس q کی طرف منسوب ہیں حضرت رکانہ کی روایت میں یہ ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی اور پھر آپ s کے حکم سے رجوع فرمایا۔

لیکن اس روایت کی تہہ میں جائیں اور مختلف راویوں نے اس روایت کو جس طرح نقل کیا ہے، اس پر غور کریں تو اصل واقعہ اس سے مختلف ہے، اصل میں حضرت رکانہ نے اپنی بیوی کو لفظ "بتہ" کے ذریعہ طلاق دی تھی، نہ کہ صراحةً تین طلاق۔ چنانچہ دارمی کی روایت میں ہے:

انه طلق امرأته البتة فاتى النبي صلى الله عليه وسلم فذكر ذلك له، فقال ماأردت فقال واحدة، قال: تالله؟ قال: تالله، قال هو مانويت.

ترجمہ: رکانہ نے اپنی بیوی کو طلاق بتہ دے دیا وہ حضور s کی خدمت میں آئے اور اس کا ذکر کیا، آپ s نے دریافت فرمایا تمہارا کیا ارادہ تھا؟ عرض کیا ایک طلاق کا آپ s نے پوچھا: خدا کی قسم! کہا خدا کی قسم آپ s نے فرمایا، تمہاری نیت کی مطابق طلاق ہوئی۔

امام ابوداؤد نے اسی کو زیادہ صحیح قرار دیا ہے کہ حضرت رکانہ r نے طلاق "بتہ" دی تھی، کیوں کہ یہ روایت خود ان کے پوتے عبداللہ ابن علی بن یزید بن

ابو داؤد ١/ ٢٩٨۔

دارمی ٢/ ٨٦۔

رکانہ اور اہل خاندان سے منقول ہے اور ظاہر ہے کہ وہ ان کے احوال سے زیادہ واقف ہو سکتے ہیں پھر امام ابوداؤد کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عباس r کا اپنا فتویٰ بھی ایک مجلس کے تین طلاقوں کے تین ہونے کا ہے۔ چنانچہ مجاہد راوی ہیں کہ ایک صاحب عبداللہ بن عباس r کے پاس آئے اور سوال کیا کہ اس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں، حضرت عبداللہ بن عباس r نے فرمایا: تم لوگ حماقت کرتے ہو، پھر ابن عباس q نے فرمایا: تم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور تمہارے بیوی تم سے جدا ہوگئی۔ ”**عصیت ربک وبانت منک امرأتک.**“

حضرت عبداللہ بن عباس r کا یہ فتوی الفاظ کے تھوڑے فرق کے ساتھ آپ کے مختلف شاگردوں سے حدیث وآثار کی کتابوں میں نقل کیا گیا ہے اس لئے صحیح یہی ہے کہ حضرت رکانہ نے ”بتۃ“ کے لفظ سے طلاق دی تھی اور لفظ ”بتۃ“ میں ایک طلاق بائن مراد لینے کی بھی گنجائش ہے اور تین طلاق کی بھی۔ اس لئے رسول s نے ان سے قسم کھلائی کہ حقیقت معنوں میں ان کی مراد کیا ہے؟ نہ یہ کہ تین طلاق دی گئی تھی چوں کہ لفظ ”بتۃ“ سے تین طلاق بھی دی جاتی تھی اس لئے بعض حضرات کو غلط فہمی ہوئی کہ انہوں نے ”بتۃ“ کے بجائے تین طلاق روایت کیا۔

طاؤس کی روایت مسلم اور ابوداؤد میں آئی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ابوصہباء نامی شخص نے عبداللہ ابن عباس r سے دریافت کیا کہ کیا حضور s حضرت ابوبکر r اور حضرت عمر r عہد خلافت کے ابتدائی تین سال میں تین طلاق ایک شمار نہ کی جاتی تھی؟ حضرت عبداللہ ابن عباس r نے فرمایا کہ ہاں! جب عہد فاروقی میں لوگ بکثرت اس طرح طلاق دینے لگے تو

ابو داؤد ۱/ ۲۹۹۔

حوالۂ سابق۔

First Proof	15-06-09
Second Proof	00-00-00
FINAL	00-00-00
TOTAL-PAGE	242-1st-proof

حضرت عمر نے ان کو جاری فرمادیا اس روایت کا حال یہ ہے کہ امام نووی نے اس روایت کے بارے میں لکھا ہے:۔

اما هذه الرواية التي لابي داؤد فضعيفة رواها ايوب السختياني عن قوم مجهولين عن طاؤس عن ابن عباس فلا يحتج بها.

ترجمہ: ابوداؤد کی یہ روایت ضعیف ہے۔ اس کو ایوب سختیانی نے کچھ مجہول لوگوں سے بہ واسطہ طاؤس حضرت عبداللہ بن عباس r سے نقل کیا ہے، اسلئے اسے استدلال نہیں کیا جاسکتا۔

ایسا بھی ممکن ہے کہ حدیث کا منشاء طلاق کی ایسی صورت ہو جس میں فقرۂ طلاق کی تکرار تو ہو لیکن تین کی صراحت نہ ہو جیسے یوں کہا جائے تجھے طلاق ہو، تجھے طلاق ہو، تجھے طلاق ہو، اس میں دو احتمال ہے: ایک یہ کہ مقصود تو ایک ہی طلاق کا دینا ہو، دوسری اور تیسری دفعہ محض ازراہ تاکید طلاق کا تکرار کیا گیا ہو، ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ایک ہی طلاق واقع ہوگی اور اگر تین طلاق دینا ہی مقصود ہو تو تین طلاق واقع ہوگی۔ ابتدائی دور میں چوں کہ سچائی کا غلبہ تھا اس لئے لوگوں کی نیت پر اعتماد کیا جاتا تھا، حضرت عمر r نے محسوس کیا کہ اب نیتوں میں فساد آگیا ہے اس لئے انہوں نے نیت کا اعتبار کرنا چھوڑ دیا، یہی حضرات فقہاء کی رائے ہے کہ اگر اس طرح طلاق دی جائے اور طلاق دینے والے کی نیت ایک ہی طلاق دینے کی ہو تو دیانۃً ایک ہی طلاق واقع ہوگی لیکن اگر معاملہ قاضی کے پاس آئے تو اس کے لئے جھوٹ کا احتمال پائے جانے کی وجہ سے اس کی نیت کو قبول کرنا ضروری نہ ہوگا۔

یہ بات دو وجھوں سے قرین قیاس ہے۔ اول اس لئے کہ حضرت عبداللہ ابن

مسلم: ۱/ ٤٧٨، ابو داؤد ۱/ ۲۹۹۔

شرح نووی علیٰ مسلم: ۱/ ٤٧٨۔

عباس r کا فتویٰ ایک مجلس کی تین طلاقوں کے واقع ہوجانے پر ہے۔

دوسرے یہ بات بالکل ناقابل قیاس ہے کہ حضرت عمر r نے ایک ایسی بات کو رواج دیا ہو جس کی دین میں کوئی اصل نہ ہو، ایک تو خود حضرت عمر r سے یہ بات بعید ہے اور اس سے زیادہ بعید بات یہ ہے کہ حضرت عمر r کے اس اقدام پر تمام صحابہ کرام p نے خاموشی اختیار کر لی ہو اور اس پر کوئی نکیر نہ کی ہو اور پھر اس کا ایسا تعامل ہوا ہو کہ قریب قریب تمام ہی اہل سنت نے اسی پر اپنے مسلک کی بنیاد رکھی ہو۔

سعودی عرب میں وہاں کے اکابر علماء اور ارباب فتاویٰ کی ایک مجلس ''ھیئۃ کبار العلماء'' کے نام سے ہے جو اہم مسائل کی بابت اجتماعی غور و فکر کر کے فیصلے کرتی ہے۔ حکومت سعودیہ نے ۱۳۹۱ھ میں اس کی تشکیل کی تھی۔ اس مجلس میں شیخ عبدالعزیز بن باز حفظہ اللہ کے بشمول سعودی عرب کے تمام ہی اکابر علماء و مشائخ شریک ہیں۔ چنانچہ ربیع الثانی ۱۳۹۳ھ میں اس موضوع پر اس مجلس میں پوری وسعت کے ساتھ تبادلۂ خیال کیا گیا، اور تمام آراء اور اس کے دلائل پر بحث کرنے کے بعد جو تجویز طے پائی اس کا حاصل یہ ہے کہ ایک ہی فقرہ میں دی گئی تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔

[ ]

مصافحہ کا مسنون طریقہ

غیر مقلد حضرات کا عام مسلمانوں سے جن مسائل میں اختلاف مشہور ہے ان میں سے ایک مصافحہ کا طریقہ بھی ہے، اہل حدیث حضرات کو اصرار ہے کہ مصافحہ صرف ایک ہاتھ ہی سے کیا جانا چاہئے، دو ہاتھوں سے مصافحہ کرنا مسنون طریقہ کے خلاف ہے۔ احناف کے نزدیک بہتر طریقہ ہے کہ دو ہاتھوں سے مصافحہ کیا جائے۔ اگر تمام احادیث کو سامنے رکھا جائے تو مجموعی طور پر وہ تین طرح کی نظر آتی ہیں۔ اول وہ حدیثیں جن سے دو ہاتھوں سے مصافحہ کرنا معلوم ہوتا ہے، دوسرے وہ روایات جن سے دو ہاتھ ملانا معلوم ہوتا ہے مگر اس میں اختلاف ہے کہ یہ ہاتھ ملانا مصافحہ کے طور پر تھا یا بطور بیعت کے، تیسرے وہ روایات جن سے مطلقاً ہاتھ سے مصافحہ کرنا ثابت ہوتا ہے، ایک ہاتھ یا دو ہاتھ کی صراحت نہیں ہے، البتہ احتمال دونوں ہی صورتوں کا ہے۔

دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کی روایات:

1 جس روایت سے دو ہاتھوں سے مصافحہ کرنا معلوم ہوتا ہے اس کو امام بخاری نے اس طرح نقل کیا ہے:

علمنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم التشھد و کفی بین کفیه. 🗀

ترجمہ: آپ نے مجھے تشہد سکھایا اس حال میں کہ میرا ہاتھ آپ s کے

🗀 بخاری عن ابن مسعود: ۹۲۶/۲۔

دونوں ہاتھوں کے درمیان تھا۔

2 ان النبی قال مامن مسلمین التقیا اخذ احدھما بید صاحبه الا کان حقا علی اللّٰه عزوجل ان یحضر دعائھما ولایفرق بین ایدیھما حتی یغفر لھما.

ترجمہ: آپ s نے فرمایا دو مسلمان جب بھی باہم ملتے ہیں اور ان میں سے ایک اپنے ساتھی کا ہاتھ تھام لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ پر حق ہوتا ہے کہ ان کی دعاوں میں حاضر ہو اور وہ اپنے اپنے ہاتھوں کو الگ نہیں کرتے یہاں تک کہ ان کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔

یہاں مصافحہ کے بعد دونوں کے لئے ''ہاتھوں'' کے الگ کئے جانے کا ذکر ہے اور ''جمع'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصافحہ کے لئے ایک ہاتھ کا نہیں بلکہ ہاتھوں کا استعمال ہونا چاہئے۔

3 ان رسول صلی اللّٰه علیه وسلم قال اذا تصافح المسلمان لم تفرق اکفھما حتی یغفر لھما.

ترجمہ: آپ s نے فرمایا کہ جب دو مسلمان مصافحہ کرتے ہیں تو اپنے اپنے ہاتھوں کو الگ نہیں کرتے کہ ان کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔

4 قدمنا فقیل ذاک رسول صلی اللّٰه علیه وسلم فاخذنا بیدیه.

ترجمہ: ہم آئے تو ہم سے بتایا گیا کہ وہ رسول اللہ s ہیں تو ہم نے آپ

مجمع الزائد بحوالۂ مسند احمد عن انس ۸/ ۳۶۔

مجمع الزوائد، طبرانی عن ابی امامہ۸/ ۳۷۔

بخاری عن الوازع بن عامر فی الادب المفرد۲/ ۴۳۹۔

s کے دونوں ہاتھوں کو پکڑا......یعنی مصافحہ کیا۔

جس روایت سے ہاتھ ملانا ثابت ہے لیکن بعض حضرات اس کو بیعت کے ساتھ خاص قرار دیتے ہیں وہ اس طرح ہے:

5 بایعت بھا تین نبی اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم.

ترجمہ: میں نے ان دونوں ہاتھوں سے آپ s سے بیعت کی۔

اس میں دونوں ہاتھوں کا ملانا تو صریحاً ثابت ہے لیکن بعض بھائیوں کا خیال ہے کہ یہ صورت بیعت ہی کے ساتھ مخصوص ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث کی یہ تاویل درست نہیں ہے۔ اس واقعہ کا تعلق یقیناً بیعت ہی سے ہے لیکن اس میں اور مصافحہ میں کوئی تضاد نہیں، اس لئے کہ خود مصافحہ بھی بیعت ہی کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے، چنانچہ بیعت کے متعلق بعض روایات میں ''مصافحہ'' کا صریح ذکر ہے:

اتیت النبی فی نساء لتبایعه (الحدیث) وفیه قلنا یارسول اللّٰه الا تصافحنا قال انی لا اصافح النساء.

ترجمہ: میں کچھ عورتوں کے ساتھ حضور s سے بیعت ہونے آئی......ہم نے عرض کیا، اللہ کے رسول s! آپ ہم سے مصافحہ نہیں کریں گے، فرمایا میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا۔

دیکھئے یہاں بیعت کے درمیان ہاتھ ملانے کو ''مصافحہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے اور چوں کہ عورت سے مرد کے لئے مصافحہ کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے حضور s نے بیعت کے درمیان مصافحہ سے انکار کر دیا، پس دراصل یہ حدیث دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کی صریح دلیل ہے۔

بخاری عن مسلم بن اکوع فی الادب المفرد۲/ ۴۳۸۔

ترمذی ونسائی عن امیمہ بنت رقیقہ۲/ ۱۸۳۔

مبہم روایات:

1 قال رجل یا رسول اللّٰہ الرجل منا یلقی اخاہ اوصدیقہ اینحنی لہ قال لا، قال افیلتزمہ ویقبلہ قال لا، قال افیاخذ بیدہ ویصافحہ قال نعم.

ترجمہ: ایک شخص نے کہا، اللہ کے رسول s ہم میں سے ایک شخص اپنے بھائی یا دوست سے ملاقات کرتا ہے کیا وہ اس کے لئے جھکے؟ آپ s نے فرمایا نہیں۔ دریافت کیا: کیا چمٹائے اور بوسہ لے؟ آپ s نے فرمایا نہیں، پوچھا: کیا اس کا ہاتھ تھام کہ مصافحہ کرے؟ آپ s نے فرمایا ہاں۔............

2 کنا مع النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم وھو اخذ بید عمر بن الخطاب فقال لہ عمر یارسول اللّٰہ! لانت احب الی من کل شیئی الا نفسی فقال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم لاوالذی نفسی بیدہ حتی اکون احب الیک من نفسک فقال لہ عمر فانہ الاٰن واللّٰہ فقال النبی الاٰن یاعمر.

ترجمہ: ہم لوگ حضور s کے ساتھ تھے اور آپ s حضرت عمر r کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے حضرت عمر r نے عرض کیا: اللہ کے رسول! آپ s مجھے میری جان کے علاوہ ہر چیز سے زیادہ عزیز ہیں، آپ s نے فرمایا نہیں، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یہاں تک کہ میں تیرے نزدیک تیری ذات سے بھی زیادہ محبوب ہوجاؤں، حضرت عمر r نے عرض کیا، اب بخدا! آپ s مجھے اپنی ذات سے بھی زیادہ محبوب ہیں، آپ

ترمذی عن انس ۲/ ۱۰۲۔

بخاری عن عبداللہ بن ہشام ۲/ ۹۲۶۔

s نے فرمایا کہ اے عمر! اب تمہارا ایمان معتبر ہے۔

3 کانت اذا دخلت علیہ قام الیھا فاخذ بیدھا فقبلھا فاجلسھا فی مجلسہ وکان اذا دخل علیھا قامت الیہ فاخذت بیدہ فقبلتہ فاجلستہ فی مجلسھا.

ترجمہ: حضرت فاطمہ R جب حضور s کے ہاں آتیں تو حضور s ان کے لئے کھڑے ہوجاتے، ان کا ہاتھ پکڑتے، ان کو بوسہ دیتے اور اپنی جگہ بٹھاتے، اسی طرح حضور s جب حضرت فاطمہ R کے پاس تشریف لاتے تو کھڑی ہوتیں، آپ کا ہاتھ پکڑتیں، آپ s کو بوسہ دیتیں اور اپنی جگہ بٹھاتیں۔

4 کان النبی اذالقی الرجل فکلمہ لم یصرف وجھہ حتی یکون ھوالذی یتصرف واذا صافحہ لم ینزع یدہ من یدہ حتی یکون ھوالذی ینزعھا.

ترجمہ: آپ s جب کسی سے ملتے اور گفتگو کرتے تو اپنی توجہ نہ موڑتے یہاں تک کہ وہ خود رخ موڑ لیتے اور جب مصافحہ کرتے تو اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نہ کھینچتے تا آنکہ وہ خود اپنا ہاتھ نہ کھینچ لے۔

5 عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال ان المؤمن اذا لقی المؤمن فسلم علیہ واخذ بیدہ فصافحہ تناثرت خطایاھما کما یتناثر ورق الشجر.

بخاری۔ ابوداؤد عن عائشۃ R: ۲/ ۷۰۸۔

ابن ماجہ عن انس r ۲/ ۲۶۴۔

مجمع البحرین ۵/ ۲۶۴ بحوالہ طبرانی عن حذیفہ۔

ترجمہ: آپ s سے مروی ہے، آپ s نے فرمایا: جب مسلمان سے ملاقات ہوا سے سلام کرے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر مصافحہ کرے تو ان دونوں کے گناہ اس طرح جھڑ جاتے ہیں جیسے درخت کے پتے۔

اسی مضمون کی روایت مسند احمد میں حضرت انس r اور حضرت براء بن عازب سے بھی منقول ہے۔

ان روایات میں مطلقاً ہاتھ سے مصافحہ کرنے کا ذکر ہے، چونکہ عربی زبان میں ''ید'' واحد ہے، اس لئے بعض لوگوں نے اس کا مفہوم یہ سمجھا ہے کہ آپ s کی سنت ایک ہی ہاتھ سے مصافحہ کرنے کی ہے لیکن اس حدیث سے صراحۃً اور قطعاً ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا ثابت نہیں ہوتا، اس لئے کہ کبھی صرف ہاتھ کہا جاتا ہے اور اس سے دونوں ہاتھ مراد لئے جاتے ہیں، مثلاً کوئی شخص کہے کہ ''میں نے خود اپنے ہاتھ سے چاول کا تھیلا اٹھالیا'' تو عرف میں اس کا مطلب یہ نہیں سمجھا جاتا کہ صرف ایک ہی ہاتھ سے اس نے تھیلا اٹھایا ہوگا۔ پیدل چلنے کو ''پاپیادہ چلنا'' کہا جاتا ہے، یہاں ''پا'' کا لفظ واحد ہی ہے جس کے معنیٰ پاؤں کے ہیں لیکن کوئی بیوقوف ہی اس کا مفہوم یہ سمجھ سکتا ہے کہ فلاں شخص صرف ایک پاؤں سے چل رہا تھا، عربی قواعد کی اصطلاح میں اس کو ''جنس'' کہا جاتا ہے، یعنی لفظ واحد کا استعمال کیا جائے اور مراد اس سے اس کی پوری جنس لی جائے، مثلاً **ان الانسان لفی خسرٍ** (بیشک انسان نقصان میں ہے)۔

اس آیت میں لفظ ''انسان'' واحد ہی ہے لیکن اس سے مراد صرف ایک آدمی نہیں ہے بلکہ پوری جنس انسانیت ہے۔ اسی طرح جن روایات میں مصافحہ کے لئے ''ید'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور واحد کے صیغہ سے تعبیر کیا گیا ہے وہاں دراصل صرف ایک ہاتھ مراد نہیں ہے بلکہ ہاتھ کی جنس مراد ہے اور ہاتھ دو ہیں۔

دیکھئے: مجمع الزوائد ۸/ ۳۶، باب المصافحة والسلام ونحو ذالك۔

39
J:\2009\ZamZam\Rah-e-Aetidal\1st Proof Chp-3-ok ....(15-06-09)

First Proof	15-06-09
Second Proof	00-00-00
FINAL	00-00-00
TOTAL-PAGE	242-1st-proof

تاہم چوں کہ اس میں دونوں ہی مفہوم کا احتمال ہے اسی لئے محققین نے ایک ہاتھ اور دو ہاتھ دونوں ہی طرح مصافحہ کو حدیث سے ثابت تسلیم کیا ہے۔

والحق فيه ان المصافحة ثابت باليد واليدين.

ترجمہ: حق یہ ہے کہ رسول کا ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا بھی ثابت ہے اور دونوں ہاتھوں سے بھی۔

کلمہ عدل:

پس حق وانصاف کی بات یہ ہے کہ مصافحہ کے یہ دونوں ہی طریقے ثابت ہیں البتہ امام بخاری کی روش سے معلوم ہوتا ہے کہ سلف سے دونوں ہاتھوں کا مصافحہ ہی متوارث رہا ہے اور یہی طریقہ صالحین کا معمول تھا، چنانچہ خود امام بخاری l نے اپنی صحیح میں ''باب المصافحہ'' میں صرف عبداللہ بن مسعود r کی روایت نقل کی ہے جس میں تشہد سکھاتے ہوئے آپ s کے دونوں ہاتھوں سے حضرت ابن مسعود r کا ہاتھ تھامنے کا ذکر ہے اور اس کے بعد فوراً ہی دوسرا باب ''**باب الاخذ باليدين**'' (دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کا بیان) کے عنوان سے قائم کر کے اس طرح لکھا ہے: **وصافح حماد بن زيد ابن المبارك بيديه** (حماد نے ابن مبارک سے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا) جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ امام بخاری l کے زمانہ میں بزرگوں کا معمول دونوں ہی ہاتھوں سے مصافحہ کرنے کا تھا اور بہ ظاہر ان حضرات تک یہ معمول صحابہ p ہی کے عہد سے نسلاً بعد نسل پہنچا ہوگا۔ اس لئے یہ بات بجائے خود دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے، حدیثیں بھی اس بارے میں صریح ہیں اور ان کے

العرف الشذی: ۲/ ۱۰۱۔

بخاری عن ابن مسعود ۲: ۲/ ۹۳۶۔

مقابل جن روایتوں سے ایک ہاتھ کا مصافحہ معلوم ہوتا ہے وہ احتمال سے خالی نہیں ہیں۔ نیز دونوں ہاتھوں سے مصافحہ میں تواضع اور انکسار اور عجز و نیاز کا اظہار زیادہ ہے اور یہی باہمی ملاقات سے مطلوب ہے، اور ان کے علاوہ ایک ہاتھ سے مصافحہ عیسائیوں اور آج کل کے فساق و فجار کا شیوہ ہے ایک ہاتھ سے مصافحہ میں ان سے تشابہ اور ظاہری یکسانیت محسوس ہوتی ہے، دونوں ہاتھوں سے مصافحہ میں یہ بات نہیں ہوتی، اس لئے زیادہ بہتر طریقہ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا ہے، اسی بات کو فقہاء نے سنت سے تعبیر کیا ہے۔

السنة فی المصافحة بکلتا یدیه. [1]

ترجمہ: مسنون طریقہ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا ہے۔

لیکن ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا بھی چونکہ فی الجملہ احادیث سے ثابت ہے، اس لئے ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا بھی درست ہے، اس میں شدت نہ برتنی چاہئے، علامہ انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں:

اعلم ان کمال السنة فیها ان تکون بالیدین وتتأدی اصل السنة من ید واحدة ایضًا. [2]

ترجمہ: جان لو، کمال سنت یہ ہے کہ مصافحہ دو ہاتھوں سے ہوتا ہم محض سنت ایک ہاتھ سے بھی ادا ہو جائے گی۔

هٰذا ماعندی والله اعلم بالصواب.

[1] العرف الشذی مع الترمذی: ۲/ ۱۰۱۔

[2] حوالہ سابق۔ وشرح الادب المفرد: ۲/ ۴۳۱۔

First Proof	15-06-09
Second Proof	00-00-00
FINAL	00-00-00
TOTAL-PAGE	242-1st-proof

کتابیات

(الف)

آثار السنن.

ابجد العلوم.

ابن حبان.

ابن ماجه.

ابو داؤد.

اتحاف.

اجتهاد وتقلید کا آخری فیصله.

الاجوبة الفاضلة.

احکام القرآن.

الاحکام للآمدی.

الاربعین.

اعلاء السنن.

اعلام الموقعین.

الافصاح علی فکت ابن الصلاح.

الاکمال فی اسماء الرجال.

امام الکلام.

الانتقاء.

الانصاف فی سبب الاختلاف.

اوجز المسالک.

(ب)

البحر الرائق.

بخاری.

هدایة المجتهد.

البدایة والنهایة.

بذل المجهود.

بوادر النوادر.

بیهقی.

(پ)

پیغام حق.

(ت)

تاریخ احمدیه.

تبییض الصحیفه.

تحدیث نعمت.

تحفة الاحوذی.

تحقیق الدکتور مصطفی اعظمی. (ابن ماجه)

تدریب الراوی.

تذکرة الحفاظ.

ترمذی.

التعليق الحسن.

تفسير ابن كثير.

تفسيرقرطبی.

تقريب التهذيب.

تنوير الابصار.

تهذيب التهذيب.

تيسير التحرير.

(ج)

جامع بيان العلم.

جامع المسانيد.

جزء القراء ة.

الجنة لاهل السنة.

الجوهر النقی.

(ح)

صاوی علی الشرح الصغير.

حجة اللّٰه البالغة.

حديث اور اهلحديث.

حسن العزيز.

الحطة فی ذكر الصحاح الستة.

(خ)

خلافت راشده.

الخيرات الحسان.

(د)

دار قطنی.

دارمی.

دستور العلماء.

(ذ)

ذكر حبيب.

(ر)

رحمة الامة.

ردالمحتار.

رساله اعداد الجنة.

رساله اشاعت السنة.

رسائل اهل حديث.

الروض المربع.

(ز)

زرقانی.

(س)

سنن بيهقی.

سيرت المهدی.

سيدنا حسن بن علی.

(ش)

شرح الادب المفرد.

شرح زرقانی.

الشرح الصغير.

شرح مؤطا للباجی.

شرح معانی الآثار.

شرح نووی علیٰ مسلم.

الشيخ محمد بن عبدالوهاب عقيدتهُ السلفية ودعوته الاصلاحية وثناء العلماء عليه.

(ص)

صحيح ابن خزيمه.

صديقهٔ كائنات.

(ط)

طبرانی.

طبقات الشافعية الكبریٰ.

طحاوی.

طريق محمدی.

(ع)

العرف الشذی.

عقود الجواهر المنيفة.

عقود الجمان.

عمدة القاری.

(غ)

غاية الاوطار.

(ف)

فتاویٰ ابن تيميه.

فتاویٰ عالمگيری.

الفتح الربانی.

فتح القدير.

فتح المغيث.

فتح الملهم.

الفيصلة الحجازيه.

فيض الباری.

(ق)

القول الجليل.

القول المسدد.

(ك)

كتاب الام.

كتاب التوحيد فی رد اهل الالحاد والبدعة.

كشف الحجاب.

كشف الغمه.

(ل)

لغاتِ حديث.

(م)

متن الغاية والتقريب.

مجدد اعظم.

مجموعة الرسائل الكبریٰ.

مجمع الانهر.

مجمع الزوائد.

مجمع البحرين.

المحلی.

مختصر قيام الليل.

المدونة الكبریٰ.

مراسيل ابوداؤد.

مسند احمد.

مسند ابو عوانه.

مسند ابويعلیٰ.

مسند بزار.

مستدرک حاکم.

مسند طيالسی.

مسلم.

مشکوٰة.

مشکل الآثار.

مصنف ابن ابی شيبه.

مصنف عبدالرزاق.

المطالب العالية.

المغنی.

مفتاح السّعادة.

مقدمه نصب الراية.

ملفوظاتِ احمديه.

مناقبِ الامام ابو حنيفه.

المناقب للموفق.

منهاج السنة.

موجِ کوثر.

مؤطا امام محمد.

مؤطا امام مالک.

مولانا داؤد غزنوی.

موارد الظمآن.

المهذب.

الميزان الكبریٰ.

(ن)

نسائی.

نزل الابرار.

نصب الرايه.

النهايه.

(ہ)

هدية المهدی.

مِنہَا العلمُ والدِیانَۃُ والإصابَۃُ فی القولِ وحِکَمُۃٌ کَثِیرۃٌ ماثُوْرَۃٌ کان یُفْتِیْ قَبْلَ بَعْثِ داؤدَ واَدْرک زَمَنَہٗ واخذَ منہ العلمَ وترکَ الفُتْیا وقال فِیْ ذٰلکَ اَلاَ اَکْتفِی اِذَا کُفِیْتُ وقیل لہ اَیُّ الناسِ شرٌّ قال الذِیْ لا یُبالی اَنْ راٰہ النَّاسُ مسِیْئًا

اَیْ وقُلْنا لہٗ اَنْ علٰی ما اَعْطاك من الحکْمۃِ لاَنَّ ثوابَ شُکْرِہٖ لہ النِعْمَۃَ

عن خَلْقِہٖ مَحْمُوْدٌ فی صَنْعِہٖ اذ کر تَصْغیرُ اشْفَاقٍ

بِاللّٰہِ فَرجَع اِلَیْہِ واَسْلمَ اَمَرْنَاہُ اَنْ یَبرَّہُمَا فَوَہَنَتُ ای ضَعُفَتُ

للحَمْلِ وضَعُفَتُ للطَّلْق وضَعُفَتُ لِلولادَۃِ فِطَامُہٗ وَقُلْنا لہٗ ای المرْجع

موافِقۃٌ لِلوَاقع ای بالمَعْرُوْفِ البِرّ والصِّلۃِ

طریقَ رَجَعَ بالطَاعۃِ فأُجازِیْکم عَلَیْہِ وجمْلَۃُ الوَصِیَّۃِ

وَمَابعدَہا اعْتِرَاضٌ ای الخَصْلَۃَ السَّیِّئَۃَ ای فِی

اَخْفٰی مَکان مِنْ ذٰلك فیُحاسِبُ عَلَیْہا باِسْتِخْرَاجِہَا بِمَکَانِہا

بِسَبَبِ الاَمْرِ والنَہْیِ المَذْکُوْرَ ای

مَعْزُوْماتِہا الَّتِیْ یُعْزَمُ علَیْہا لِوُجُوْبِہا وفی قراءۃٍ تُصَاعِرْ لَا تُمِلْ وَجْہَكَ عَنْہم تکبُّرًا

ای خیْلاَءَ مُتَبخْترٍ فی مَشْیِہٖ علٰی النّاسِ تَوَسّط فِیہ بَیْنَ الدَّبِیْبِ والإسْرَاعِ

وَعَلَیْكَ السَّکِیْنَۃُ والوَقارُ اخْفِضْ اَقْبَحَہا اوّلُہ زَفِیرٌ واٰخرُہٗ شَہِیْقٌ.

اور بلاشبہ ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی ان ہی میں سے علم اور دیانت اور راست گوئی ہیں، اوران کی حکمت کی (باتیں) بہت ہیں جو کہ منقول ہیں اور وہ حضرت داؤد e کی بعثت سے پہلے فتویٰ دیا کرتے تھے حضرت لقمان نے داؤد e کا زمانہ پایا تھا اور ان سے علم بھی حاصل کیا تھا، اور (داؤد e کی بعثت کے بعد) فتویٰ دینا ترک کر دیا تھا، اور فتویٰ (کے معاملہ میں) فرمایا کیا میں سبک دوشی اختیار نہ کروں؟ جب سبک دوش کیا جاؤں اور حضرت لقمان سے دریافت کیا گیا کہ بدترین شخص کون ہے؟ جواب دیا: وہ شخص جو اس بات کی پرواہ نہ کرے کہ لوگ اسے برا کرتے ہوئے دیکھیں گے یعنی ہم نے اس سے کہا تو اللہ کا شکر کر اس بات پر کہ تجھ کو حکمت عطا کی اور ہر شکر کرنے والا اپنے ہی نفع کے لئے شکر کرتا ہے اس لئے کہ اس کے شکر کا اجر اسی کو ملتا ہے اور جس نے نعمت کی ناشکری کی (وہ جان لے) کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے بے نیاز ہے اور اپنی صنعت میں قابل ستائش ہے اور اس وقت کو یاد کرو جب لقمان e نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا اے میرے مُنّے بُنَیَّ شفقت کے لئے تصغیر ہے اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا بلاشبہ شرک باللہ بڑا بھاری ظلم ہے چنانچہ اس نے لقمان کی بات مان لی اور اسلام قبول کر لیا، اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا (تاکیدی) حکم دیا ہے، اس کی ماں نے دکھ پر دکھ اٹھا کر اس کو حمل میں رکھا یعنی حمل کی وجہ سے اسے ضعف لاحق ہوا، اور دردِ زِہ کی وجہ سے کمزوری لاحق ہوئی، اور ولادت کی وجہ سے ناتوانی ہوئی، اور دو سال میں اس کا دودھ چھوٹتا ہے اور ہم نے اس سے کہا کہ تو میری اور اپنے والدین کی شکر گذاری کیا کر میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے اور اگر وہ دونوں (بھی) تجھ پر اس بات کا دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک کر کہ جس کی تیرے پاس واقع کے مطابق دلیل نہ ہو تو ان کا کہنا نہ ماننا (ہاں) دنیا میں ان کے ساتھ خوبی کے ساتھ بسر کرنا یعنی حسن سلوک کے ساتھ اور اس شخص کے طریقہ کی اتباع کرنا جو میری طرف طاعت کے ذریعہ رجوع ہو پھر تم سب کو میرے ہی پاس لوٹ کر آنا ہے پھر میں تم کو بتلا دوں گا جو کچھ تم کرتے تھے بعدازاں ان اعمال کی تم کو جزا دوں گا، وصیت اور اس کے مابعد کا جملہ جملۂ معترضہ ہے اے میرے پیارے بیٹے بری خصلت اگرچہ وہ رائی کے دانے کے برابر ہو اور پھر وہ (بھی) چٹان میں ہو یا آسمانوں میں ہو یا زمین میں ہو یعنی ان مذکورہ جگہوں سے زیادہ پوشیدہ جگہ میں ہو، اللہ تعالیٰ اس کو ضرور نکال لائے گا پھر اس پر محاسبہ کرے گا بلاشبہ اللہ اس کو نکالنے کے بارے میں باریک بین ہے اور اس کی جگہ سے باخبر ہے، اے میرے پیارے بیٹے تو نماز قائم رکھنا اور اچھے کاموں کی نصیحت کرتے رہنا برے کاموں سے منع کرتے رہنا اور امر و نہی کی وجہ سے تم پر اگر کوئی مصیبت آجائے تو صبر کرنا یقین مان کہ یہ صبر بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے یعنی یہ صبر ان امور میں سے ہے کہ جن کے واجب ہونے کی وجہ سے ان کی تاکید کی گئی ہے اور تو لوگوں سے تکبر کی وجہ سے اپنا رخ نہ پھیر اور زمین پر اترا کر مت چل یعنی عجب و خود پسندی کے ساتھ، بلاشبہ اللہ تعالیٰ اکڑ کر چلنے والوں کو اور لوگوں کے مقابلہ میں فخر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے اور تو اپنی رفتار میں رینگنے اور دوڑنے کے درمیان اعتدال اختیار کر اور وقعت و وقار کو لازم پکڑ اور اپنی آواز پست کر یقیناً آوازوں میں سب سے زیادہ ناگوار گدھے کی آواز ہے (گدھے کی آواز کا) اول حصہ زفیر ہے اور اس کا آخر شہیق ہے۔

D:\Jalalin\Vol-V\Importent\Tah-2.tif
not found.

وَلَقَدْ اٰتَینَا لُقْمَانَ الحِکْمَۃَ لقمان e کے بارے میں بعض نے کہا یہ عجمی لفظ ہے اور علمیۃ اور عجمہ کی وجہ سے غیر منصرف ہے، اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ عربی لفظ ہے علمیۃ اور الف نون زائدتان کی وجہ سے غیر منصرف ہے، حضرت لقمان کے نسب کے بارے میں مختلف اقوال ہیں بعض حضرات لقمان بن باغور بن ناخور بن تارخ اور تارخ آزر ہی کا نام ہے، اس نسب کے اعتبار سے لقمان e حضرت ابراہیم e کے بھائی کے پوتے ہوتے ہیں اور بعض حضرات نے حضرت ایوب e کے بھانجے کہا ہے، اور بعض نے حضرت ابراہیم e کا خالہ زاد بھائی بتایا ہے، کہا گیا ہے کہ حضرت لقمان e ایک ہزار سال بقید حیات رہے حتی کہ حضرت داؤد e کا زمانہ پایا، جمہور اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت لقمان حکیم تھے نبی نہیں تھے، البتہ عکرمہ اور شعبی ان کی نبوت کے قائل ہیں۔ (صاوی)

أن. ای وقُلْنَا لَہٗ شارح ا نے اس تفسیری عبارت سے دو باتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے، اول یہ کہ أن تفسیریہ ہے، دوسرے یہ کہ حذف قلنا کے ذریعہ أن اشکر کا عطف ولقد اٰتینَا لُقمٰنَ پر ہے، حضرت لقمان e کے صاحبزادے کے نام میں تین قول ہیں، بعض نے ''ثاران'' بتایا ہے، اور کلبی نے ''مشکم'' کہا ہے اور بعض نے ''انعم'' بتایا ہے (جمل) کہا گیا ہے کہ حضرت لقمان e کی اہلیہ اور صاحبزادے کافر تھے، آپ کی نصیحت سے مسلمان ہوگئے۔

فَرَجَعَ وَاَسْلَمَ یہ عطف تفسیری ہے۔

وَوَصَّیْنَا الانسانَ یہ دو آیتیں حضرت سعد بن ابی وقاص r کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، جیسا کہ سابق میں گذر گیا ہے اور یہ دو آیتیں حضرت لقمان کے کلام کے درمیان جملہ معترضہ کے طور پر واقع ہوئی ہیں۔

وَهَنَتْ وَهْنًا علٰی وَهْنٍ مفسر علام نے وَهْنًا سے پہلے وَهَنَتْ فعل محذوف مان کر اشارہ کردیا کہ وهْنًا فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے اور عَلٰی وَهْنٍ یہ کائناً محذوف سے متعلق ہو کر وَہْنًا کی صفت ہے ای وَهْنًا کائنًا عَلٰی وَهْنٍ اور صاوی نے کہا ہے کہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ اُمُّہٗ سے حال قرار دیا جائے، ای حملَتْہُ اُمُّہٗ ذات وهنٍ.

موافقة لِلوَاقع شارح ا مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ کے بارے میں فرما رہے ہیں کہ یہ قید بیان واقعہ کے لئے ہے یعنی واقعی اور حقیقت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے تو پھر اس کا علم یا دلیل کہاں ہوگی؟ یہ قید احترازی نہیں ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہوا کہ جس کے شریک ہونے کی تیرے پاس دلیل نہ ہو اس کو شریک نہ کر اور جس کے شریک ہونے کی دلیل ہو اس کو شریک کرسکتا ہے یہ اس کا مفہوم مخالف ہوگا، جو معتبر نہیں ہے اسی کو کہا جاتا ہے لا مفهومَ لہٗ یعنی اس کا مفہوم مخالف مراد نہیں ہے۔

وَوَصَّیْنَا الانسانَ سے دو آیتیں، حضرت لقمان e کے کلام کے درمیان بطور جملہ معترضہ کے ہیں، مقصد ان کا حضرت لقمان کے کلام کی تاکید ہے یا بُنَیَّ یہ حضرت لقمان e کا اپنے بیٹے کو نصیحت کی جانب عود ہے۔

فی صخرۃٍ، صخرۃ مطلقا پتھر کی چٹان کو کہتے ہیں اور ساتویں زمین کے نیچے جو سخت پتھر ہے اس کو بھی کہتے ہیں۔

لا تُصَعِّرْ فعل نہی تو نہ موڑ، یہاں تکبر کی وجہ سے رخ پھیرنے سے نہی ہے۔

وَلَقَدْ آتَیْنَا لُقْمَانَ حضرت لقمان e وہب بن منبہ کی روایت کے مطابق حضرت ایوب e کے بھانجے تھے اور مقاتل نے ان کا خالہ زاد بھائی بتلایا ہے، تفسیر بیضاوی وغیرہ میں ہے کہ ان کی عمر دراز ہوئی، حضرت لقمان نے حضرت داؤد e کا زمانہ پایا تھا۔

اور تفسیر درمنثور میں حضرت ابن عباس کی روایت یہ ہے کہ حضرت لقمان ایک حبشی غلام تھے، نجاری کا کام کرتے تھے اور حضرت جابر بن عبداللہ سے ان کے حالات دریافت کئے گئے تو فرمایا پست قد، چپٹی ناک کے حبشی تھے، ایک حبشی حضرت سعید بن مسیّب کے پاس کوئی مسئلہ دریافت کرنے کے لئے آیا تو حضرت سعید نے ان کی دل جوئی کے لئے فرمایا کہ تم اپنے کالے ہونے پر غم نہ کرو کیونکہ کالے لوگوں میں تین بزرگ ایسے گذرے ہیں جو لوگوں میں سب سے بہتر تھے 1 حضرت بلال حبشی 2 اور مَہْجَع حضرت عمر r کے آزاد کردہ غلام اور 3 حضرت لقمان e۔

حضرت لقمان جمہور سلف کے نزدیک نبی نہیں تھے، بلکہ ولی اور حکیم تھے، ابن کثیر نے بھی ان کے نبی نہ ہونے پر اتفاق نقل کیا ہے، صرف عکرمہ نے ان کو نبی کہا ہے مگر اس کی سند ضعیف ہے۔

جب جمہور کے نزدیک حضرت لقمان کا نبی نہ ہونا راجح بلکہ مسلم ہے تو پھر ان کو وہ حکم جو قرآن میں مذکور ہے أن اشکر لی یہ بذریعہ الہام ہوسکتا ہے جو اولیاء اللہ کو حاصل ہوتا ہے۔

حضرت لقمان e حضرت داؤد e سے پہلے شرعی مسائل میں لوگوں کو فتویٰ دیا کرتے تھے، جب داؤد e کو نبوت عطا کی گئی تو فتویٰ دینا چھوڑ دیا اور فرمایا کہ اب میری ضرورت نہیں رہی، اس بات سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ لقمان نبی نہیں تھے اس لئے کہ کسی نبی کے لئے یہ درست نہیں کہ وہ کار نبوت کو ترک کردے، بعض روایات میں ہے کہ بنی اسرائیل کے قاضی تھے، حضرت لقمان کے کلمات حکمت بہت منقول ہیں، وہب بن منبہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت لقمان کی حکمت کے دس ہزار سے زیادہ ابواب پڑھے ہیں۔ (قرطبی، معارف)

ایک روز حضرت لقمان ایک بڑی مجلس میں لوگوں کو حکمت کی باتیں سنا رہے تھے ایک شخص آیا اور اس نے سوال کیا کہ کیا تم وہی نہیں جو میرے ساتھ فلاں جنگل میں بکریاں چرایا کرتے تھے، لقمان e نے فرمایا ہاں میں وہی ہوں، تو اس شخص نے پوچھا کہ پھر آپ کو یہ مقام کیسے حاصل ہوا کہ خلقِ خدا آپ کی تعظیم کرتی ہے اور آپ کے کلمات سننے کے لئے دور دور سے جمع ہوتی ہے، حضرت لقمان e نے فرمایا کہ اس کا سبب میرے دو کام ہیں، اوّل ہمیشہ سچ بولنا، دوسرے فضول باتوں سے اجتناب کرنا اور ایک روایت میں یہ ہے کہ لقمان نے فرمایا کہ چند کام ایسے ہیں جنہوں نے مجھے اس درجہ پر پہنچایا، اگر تم اختیار کرلو تو تمہیں بھی یہی درجہ اور مقام حاصل ہو جائے گا وہ کام یہ ہیں، اپنی نظر کو پست رکھنا، زبان کو بند رکھنا، حلال روزی پر قناعت کرنا، اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنا، بات کی سچائی پر قائم رہنا، عہد پورا کرنا، مہمان کا اکرام کرنا پڑوسی کی حفاظت کرنا، اور فضول کام اور فضول کلام چھوڑ دینا۔ (ابن کثیر)

حکمت لقمان سے کیا مراد ہے؟

لفظ ''حکمت'' قرآن کریم میں متعدد معانی کے لئے استعمال ہوا ہے، علم، عقل، حلم، بردباری، نبوت، اصابت رائے، ابوحیان نے فرمایا کہ حکمت سے مراد وہ کلام ہے، جس سے لوگ نصیحت حاصل کریں، اور ان کے دلوں میں مؤثر ہو اور جس کو لوگ محفوظ کر کے دوسروں کو پہنچائیں، اور حضرت ابن عباس q نے فرمایا کہ حکمت سے مراد عقل و فہم اور ذہانت ہے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ علم کے مطابق عمل کرنا حکمت ہے۔

آیت مذکور میں حضرت لقمان e کو حکمت عطا کرنے کا ذکر فرما کر آگے فرمایا ہے اَن اشْکُرْ لی یہ خود حکمت کی تفسیر ہے یعنی وہ حکمت جو لقمان e کو دی گئی تھی کہ ہم نے اس کو شکر کا حکم دیا، انہوں نے تکمیل کی اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر گذار ہونا بڑی حکمت ہے، اس کے بعد یہ جتلا دیا کہ یہ شکر گذاری کا حکم ہم نے کچھ اپنے فائدے کے لئے نہیں دیا، ہمیں کسی کے شکر کی حاجت نہیں بلکہ یہ ان ہی کے فائدے کے لئے دیا ہے کیونکہ ہمارا ضابطہ یہ ہے کہ جو شخص ہماری نعمت کا شکر ادا کرتا ہے، ہم اس کی نعمت میں اور زیادتی کر دیتے ہیں۔

اس کے بعد لقمان e کے کچھ کلمات حکمت کا ذکر فرمایا ہے جو انہوں نے اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے ارشاد فرمائے تھے وہ کلمات قرآن کریم نے اس لئے نقل فرمائے کہ دوسرے لوگ بھی ان سے فائدہ اٹھائیں، ان کلمات حکمت میں سب سے اول تو عقائد کی درستی ہے اور ان میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کو سارے عالم کا خالق و مالک بلا شرکت غیرے یقین کرے اس لئے کہ اس دنیا میں اس سے بڑا بھاری ظلم کوئی نہیں ہو سکتا کہ خدائے تعالیٰ کی کسی مخلوق کو خالق کے برابر ٹھہرائے، اس لئے فرمایا یٰبُنَیَّ لاَ تُشْرِکْ بِاللّٰہِ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ کے بعد حضرت لقمان کی دوسری نصائح اور کلمات حکمت بیان ہوئے ہیں جو اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے فرمائے تھے، حکمت لقمان کے کچھ کلمات قرآن کریم نے اس لئے نقل فرمائے ہیں تاکہ دوسرے لوگ بھی اس سے استفادہ کریں۔

والدین کی اطاعت فرض ہے بشرطیکہ معصیت الٰہی نہ ہو:

والدین کی اطاعت اور شکر گزاری کی بڑی تاکید فرمائی گئی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت و شکر گذاری کے ساتھ ساتھ والدین کی شکر گذاری اور اطاعت کا حکم دیا ہے، لیکن شرک ایسا ظلم عظیم اور سنگین جرم ہے کہ وہ والدین کے کہنے اور ان کے مجبور کرنے سے بھی جائز نہیں۔

یہاں والدین کی شکر گذاری اور اطاعت کا حکم دیا گیا ہے ساتھ ساتھ اس کی حکمت بھی بیان فرما دی کہ اس کے وجود و بقاء میں والدین کا بہت بڑا دخل ہے، خاص طور سے اس کی ماں کو اس کے وجود و بقاء کے لئے بڑی مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے، اسی لئے ماں کے حقوق پہلے بیان فرمائے ہیں، وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْہِ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰی وَهْنٍ وَفِصَالُهٗ فِیْ عَامَیْنِ ممکن تھا کہ بیٹا والدین کے شرک کے لئے مجبور کرنے اور دباؤ ڈالنے کی وجہ سے رنجیدہ اور کبیدہ خاطر ہو کر والدین کے ساتھ بدکلامی یا بدخوئی سے پیش آئے ان کی توہین کرے، اسلام چونکہ ایک قانون عدل ہے اس لئے ساتھ ہی یہ حکم بھی دیدیا وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا یعنی معصیت کے معاملہ میں تو تم ان کا کہنا نہ مانو البتہ دنیا کے کاموں میں اس کے عام دستور کے مطابق معاملہ کرو، مالی اخراجات وغیرہ میں کمی نہ ہونے دو اور نہ عزت و احترام میں کسی قسم کی کوتاہی ہونے دو۔

اس آیت میں جو بچے کے دودھ چھڑانے کی مدت دو سال بتلائی گئی ہے، یہ عام عادت کے مطابق ہے اس میں اس کی کوئی صراحت نہیں کہ اس سے زیادہ مدت تک دودھ پلایا جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ اس مسئلہ کی تشریح انشاء اللہ سورۂ احقاف کی آیت وحملہ وفصالہ ثلثون شهرًا کے تحت آئے گی۔

اِنْ تَکُ کا مرجع اگر خطیئة ہو تو مطلب گناہ اور اللہ کی نافرمانی والا کلام ہے اور اگر اس کا مرجع خصلة ہو تو مطلب اچھی یا بری خصلت ہوگا، خلاصہ یہ ہے کہ انسان اچھا یا برا عمل کتنا ہی چھپ کر کرے اللہ سے مخفی نہیں رہ سکتا، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو ضرور حاضر کرلیں گے، یعنی اس کی جزاء یا سزا دے گا خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا عمل کیوں نہ ہو؟

مِنْ ذٰلِکَ ای المذکور.

اِنَّ ذٰلِکَ یہاں ذٰلِکَ کا مرجع صبر ہے۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّکَ یعنی تکبر نہ کر کہ لوگوں کو حقیر سمجھے اور جب وہ تجھ سے ہم کلام ہوں تو تو ان سے منہ پھیر لے یعنی بے رخی کرے، صعر ایک قسم کی بیماری ہے، جس کی وجہ سے اونٹ کی گردن مڑ جاتی ہے، یہاں بطور کنایہ یہ لفظ تکبر سے منہ پھیر لینے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

واقصد فی مشیک یعنی ایسی چال یا رویّہ کہ جس سے مال و دولت یا جاہ و منصب یا قوت و طاقت کی وجہ سے فخر و غرور کا اظہار ہوتا ہو، یہ اللہ کو ناپسند ہے، اس لئے کہ انسان ایک بندۂ عاجز و حقیر

زیادہ چیخ وچلا کر بات نہ کر، اس لئے کہ اگر زیادہ اونچی آواز سے بات کرنا پسندیدہ ہوتا تو گدھے کی آواز سب سے اچھی سمجھی جاتی، حال یہ ہے کہ گدھے کی آواز سب سے زیادہ بدتر اور کریہہ ہے، حدیث میں بھی آیا ہے کہ اگر گدھے کی آواز سنو تو شیطان سے پناہ مانگو۔ **(بخاری کتاب بدء الخلق)**